تاریخ کے گمشدہ اوراق

تاریخی افسانوں کا مجموعہ

نیاز فتح پوری

ناشر
اختر کتاب گھر اردو بازار کراچی

جملہ حقوق محفوظ

سال اشاعت ۱۹۹۶ء
قیمت سو روپے
ناشر اختر کتاب گھر کراچی
مطبوعہ ایجوکیشنل پریس۔ کراچی

ملنے کا پتہ

☆ اختر کتاب گھر اردو بازار کراچی
☆ مکتبہ عالیہ اردو بازار لاہور
☆ بیکن بکس بوسن روڈ ملتان

٣

حسن کی عیاریاں

قلوپطرہ، حسن و شباب کی ان تمام آئینہ داریوں کے ساتھ جنھیں صرف اسی کا بلوریں سینہ پیش کر سکتا تھا۔ خوابگاہ ناز میں ایک مخملی صندلی پر متمکن ہے، اور اس کی جبین پیشانی، جس میں فطرت نے کائنات کو درہم برہم کر دینے کی قوت پوری طرح ودیعت کی تھی۔ سردارانِ مصر کو جو اس وقت اس کے روبرو دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں کپکپا رہی ہے۔

سرزمین فراعنہ کے ایک ایک نوجوان کو معلوم تھا کہ قلوپطرہ کے حسنِ برقِ افگن پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنا بھی گویا خرمن کو بجلی کو دعوت دینا ہے۔ چہ جائیکہ اس کے حسن برہم کو دیکھنا جس کے سامنے تو نیل کی موجیں بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی روانی کو بھلا دیتی تھیں۔

غیظ و غضب کے عالم میں اس کا سینہ سریع تنفس کی وجہ سے جلدی جلدی ابھر رہا تھا اور کافوری شمعوں کی روشنی کا عکس گھڑی گھڑی اس کاغذ پر ڈال رہا تھا، جسے وہ ہاتھ میں لئے پڑھ رہی تھی۔

بیشک میں مصر کی ملکہ ہوں اور اس وقت تک ملکہ رہنے کی کوشش کروں گی، جب تک میرے قلب میں اس کی آخری دھڑکن باقی ہے لیکن اگر

تم یا تمھارا قانون، سلطنت میں میری شرکت کو صرف اس شرط سے گوارا کر سکتا ہے کہ میں ٹولمی کو اپنے اس بستر پر جگہ دوں، جہاں سے زندہ اٹھ کر کسی کا جانا مجھے پسند نہیں، تو جاؤ اس سے کہہ دو کہ اب اس کے لئے صرف دو صورتیں ہیں، یا تو وہ شرکت حکومت کے خیال سے باز آئے یا پھر قلوپطرہ کا مقابلہ کرے، جو اک ادنیٰ اشارہ سے نیل کی تمام وادیوں کو ایک ورق کاغذ کی طرح ادھر سے ادھر اُلٹ سکتی ہے۔"

(۲)

جب جولیس سیزر، روم کا وہ پُرشوکت و جبردست جنرل۔ جس نے پامپائی فتح کرکے تمام عالم کو اپنی قوت کے افسانوں سے معمور کر رکھا تھا، حدود اسکندریہ میں پہنچا، تو اسے معلوم ہوا کہ یہاں تمام ملک میں بدامنی کی حکومت ہے۔ تخت گاہ مصر کی گلیاں جوئے خوں بنی ہوئی ہیں اور قلوپطرہ کے جانباز سپاہی، ٹولمی کی وفادار سپاہ سے مصروفِ پیکار ہیں۔

اگر جولیس سیزر چاہتا تو اس تفریق سے فائدہ اٹھا کر مملکتِ مصر پر آسانی سے قابض ہو سکتا تھا، لیکن وہ اپنی تازہ فتوحات کے نشہ میں چور تھا اور اس وقت وہ صرف امن و سکون کے قیام ہی میں اپنے لئے تفریح محسوس کرتا تھا۔ اس نے یہ خیال کرکے کہ قلوپطرہ ایک عورت ہے اور یقیناً اس کے بھائی ٹولمی نے اس کا حق سلطنت غصب کر لیا ہوگا۔ اپنا ایک سردار روانہ کیا کہ قلوپطرہ اور ٹولمی دونوں کو اس کے سامنے لے آئے۔

(۳)

قلوبطرہ، جسے اپنے حسن و جمال پر ناز تھا، جو سمجھتی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی قوت ایسی نہیں ہے جو اس کے روبرو جھک جانے کی لذت حاصل کرنے کے لئے بیتاب نہ ہو۔ آرائش کے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی گیسو سنوار رہی ہے اور مسکراتی جاتی ہے اس خیال سے کہ آج اپنا وہ حربہ استعمال کرے گی، جسے وہ اپنے بھائی ٹولمی پر نہ استعمال کر سکتی تھی اور جس سے مجروح ہونے کے لئے اکاسرہ و قیاصرہ ہی کی ضرورت تھی۔

نہایت باریک آسمانی رنگ کی ریشمی چادر جس میں جابجا موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ اس کے خوبصورت جسم سے لپٹی ہوئی تھی اور باوجود کوشش کے بھی وہ کسی طرح سینہ و شانہ پر نہ ٹھہرتی تھی۔ اس نے گیسو سنوارے، لباس درست کیا اور ان تمام دلربایانہ اداؤں کے ساتھ جو مصر کی اس جوان ملکہ کے لئے مخصوص تھیں۔ نکہت کی طرح نکلی اور صرف ایک سردار کو ساتھ لے کر سیزر کے پاس روانہ ہو گئی۔

(۴)

سیزر، اپنے درباری خیمہ میں منتظر بیٹھا تھا کہ خادم نے اطلاع کی کہ ایک سردار ملکۂ قلوبطرہ کی طرف سے کوئی ہدیہ لایا ہے اور پیش کرنا چاہتا ہے۔ سیزر نے اجازت دی اور ایک خوش رو نوجوان اپنی پشت پر ایک گٹھری لئے ہوئے آیا اور اسے زمین پر رکھ کر کھولنے لگا۔

سیزر منتظر تھا کہ اس کے اندر سے سیم و زر کی کشتیاں ——— الماس و

عقیق سے جڑے ہوئے بیش بہا دیور نکلیں گے۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس کے اندر سے بجائے سیم و طلا ر، الماس و عقیق کے، ایک سرو زریں۔ ایک مجسمۂ شباب، اک پیکر حسن و جمال، ملکۂ قلوپطرہ نہایت باریک ریشمی لباس میں نمودار ہوئی، گویا وہ وینس (زہرہ) تھی جو ابھی ابھی سمندر سے نہا کر نکلی ہو۔

(۵)

ٹولمی کو مغلوب کرنے کے بعد، سیزر۔ اسکندریہ میں وہی زندگی بسر کر رہا تھا جو قلوپطرہ ایسی حسین عورت کی معیت میں بسر کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے مہر و ماہ کا طلوع و غروب، شب و روز کا ظہور و خفا، بہار و خزاں کی آمد و شد اور فطرت کے تمام متضاد مناظر، صرف قلوپطرہ کی مسرت و اضمحلال سے عبارت تھے اور وہ محسوس کرتا تھا کہ دنیا کا ہر تغیر صرف اس لئے عمل میں آتا ہے کہ قلوپطرہ کی خواہش یہی ہے۔

قلوپطرہ بیتاب تھی کہ دنیا کے اس مشہور جنرل سے شادی کر کے ہمیشہ کے لئے اس کو اپنا بنا لے، لیکن چونکہ اس کی بیوی موجود تھی اور وہ دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ روم جانے سے قبل وہ اپنی تمام خواہشیں پوری کر لے، اور جب وہ قلوپطرہ کی آغوش اور ساحل نیل سے جدا ہو، تو اس کی تمنائیں ختم ہو چکی ہوں۔

کچھ زمانہ تو سیزر نے ایسی خود فراموشی کے عالم میں بسر کر دیا کہ خود اُسے بھی خبر نہ ہوئی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اسے کیا کرنا چاہئے، لیکن جب اس کے

احباب نے روم سے اسے اطلاع دی کہ سلطنت رومہ کو اس کی واپسی کی سخت ضرورت ہے، تو اسے ہوش آیا اور اس کے تمام وہ مردانہ عزائم جو قلوپطرہ کی آغوش میں پہنچکر سو گئے تھے۔ پھر بیدار ہونے لگے۔ اس نے دفعتاً روم جانے کا ارادہ استوار کیا اور قلوپطرہ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جانا چاہا، مگر قلوپطرہ، جو اس شکار کو اپنے قابو سے جانے دینا نہیں چاہتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاید روم پہنچ کر وہ کسی تدبیر سے اس کو عقد نکاح میں لے آئے گی، اس پر راضی نہ ہوئی اور خود بھی اس کے بعد ہی روم کی طرف روانہ ہو گئی،

(۶)

سیزر بروٹس کے ہاتھ سے قتل ہو چکا ہے، روم میں انطانی اور بروٹس کے درمیان جنگ ختم ہو کر کامیابی کا سہرا انطانی کے سر پر باندھا جا چکا ہے اور قلوپطرہ کو مصر میں حکومت کرتے ہوئے تین سال گزر چکے ہیں

چونکہ قلوپطرہ کی عربدہ جو اور مصلحت اندیش فطرت، در پردہ بروٹس سے بھی لگاوٹ رکھتی تھی جو سیزر کا قاتل تھا، اس لئے انطانی نے اسے طلب کیا کہ اس الزام کی جوابدہی کے لئے حاضر ہو۔

قلوپطرہ نے جو اپنے بھائی ٹولمی کو تباہ کرا چکی تھی، جو سیزر کو بھی اپنی محبت سے آشنا کر کے برباد کر چکی تھی۔ اب اپنے سامنے ایک نیا شکار پایا اور یہ معلوم کر کے کہ اس وقت انطانی کے اقبال کا طوطی بول رہا ہے۔ اس پر اپنے حسن کا جال ڈالنا چاہا۔

قلوپطرہ جس شان سے روانہ ہوئی وہ تاریخ کا نہایت مشہور و دلچسپ واقعہ۔

ہے، اس کا جہاز زر کار تھا اور ارغوانی رنگ کے ریشمی بادبان اس کے پہلو میں اُڑ رہے تھے۔ سرزمین مصر کی حسین نوجوان لڑکیاں، اس حال میں کہ ان کے جسم پر ایک تار بھی نہ تھا۔ اس جہاز کو چلا رہی تھیں اور قلوپطرہ باصد ہزار پندار حسن و رعنائی ایک جڑاؤ صندلی پر جلوہ افروز تھی۔

انطانی نے پیام بھیجا کہ ملکۂ مصر کی پذیرائی کے لئے اس کے جہاز ہی میں انتظام کیا گیا۔ لیکن قلوپطرہ نے، جو اپنے ہی جہاز کی آراستہ فضا میں اپنا افسوں کو اچھی طرح صرف کر سکتی تھی، انطانی کو وہیں بلا لیا اور اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا، جو ہمیشہ حسن کے عزم و ارادہ کا ہوا کرتا ہے۔

(۷)

انطانی: اسکندریہ میں وہی زندگی بسر کر رہا ہے جو یونانیوں کی خیالی دنیا میں باخوس (شراب کے دیوتا) کو حاصل تھی اور حسن کے تمام وہ بھلاوے جن کو عالم قضا و قدر میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اس پر ستولی تھے، جس حالت میں اس نے روم کو چھوڑا تھا اس کا اقتضا یہ تھا کہ فوراً وہاں واپس جاتا اور اپنی حاصل کی ہوئی قوت میں استحکام پیدا کرتا۔ لیکن قلوپطرہ کی کھلی ہوئی آغوش اتنی بڑی دولت اور ایسی وسیع سلطنت تھی کہ اس کی لذتیں حاصل کرنے کے بعد انطانی کے لئے ساری کائنات کو قلوپطرہ کے آنکھوں کے عمیق سمندروں میں غرق کر دینا آسان ہو گیا تھا، چہ جائیکہ حکومت روم!

وہ ادھر مصروف نشاط رہا اور ادھر کیٹولیس سیزر نے روم پر اقتدار حاصل کر کے انطانی کو گرفتار کرنے کے لئے اسکندریہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں

انطانی کو ہوش آیا مگر اس وقت جب آکیٹوکیس کے جہاز سر پر پہنچ گئے اور اس کا نشہ اترا مگر جب تدبیر کی منزل گذر گئی۔

جب قلوبطرہ کے بیڑہ کو شکست ہوئی اور وہ اپنے قصر کے اندر جاکر بند ہو گئی۔ تو انطانی کو شبہ پیدا ہوا اور حد درجہ برہمی کے ساتھ دروازہ تک پہنچا اور اندر جانا چاہا۔ لیکن محافظین قلوبطرہ نے یہ خیال کر کے کہ انطانی کہیں برہمی کے عالم میں ملکہ کو کوئی ضرر نہ پہنچائے۔ عرض کی کہ ملکہ اب کہاں، وہ تو شکست کے غم میں کب کی جان دے چکی!!

انطانی پر اس خبر سے ردِ عمل کی سی کیفیت طاری ہوئی اور حد درجہ تکلیف و تاثر کے عالم میں اپنی جائے قیام پر گیا اور ایک تیز تلوار سے اپنے جسم کو زخمی کر کے چند دن تک، قلوبطرہ کی تیمار داری کی آخری لذتیں حاصل کرنے کے بعد اس جہان سے رخصت ہو گیا۔

انطانی کے مر جانے سے قلوبطرہ کو صدمہ ہوا یا نہیں۔ اس کا حال کسے معلوم؟ لیکن اس واقعہ کو دنیا جانتی ہے کہ جب انطانی کے بعد آکیٹوکیس، روم کا ہیرو قرار پایا اور اسکندریہ میں اس کا اقتدار قائم ہونے لگا تو قلوبطرہ نے اسے بھی مسحور کرنا چاہا۔ اور اپنی وہی زہر آلود ادائیں جو اس سے قبل سیزر و انطانی کی جان لے چکی تھیں۔ آکیٹوکیس پر بھی صرف کرنا چاہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کامیاب نہ ہوتی اگر فطرت حسن کی ان قاتل تماشہ زائیوں سے بیزار نہ ہو گئی ہوتی۔

---

(۸)

اکیٹولیس (قلوپطرہ کے سرداروں سے) :- میں ایک عورت کے خون سے خواہ وہ کتنی ہی سفاک و ظالم کیوں نہ ہو اپنی تلوار کو آلودہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے تم اپنی ملکہ سے کہہ دو کہ اس کی جان محفوظ ہے۔ لیکن صرف اس شرط سے کہ وہ میرے پاس حاضر ہو، اور جب میرا جلوس روم کے بازاروں سے گذرے تو وہ میری سواری کے پیچھے پیچھے پیادہ چلی آرہی ہو۔ میں اپنی فتوحات کی تمام لذتوں کو اس مسرت کے مقابلہ میں کہ قلوپطرہ میری حلقہ بگوش ہے۔ آسانی کے ساتھ بھلا دینے کے لئے آمادہ ہوں۔ اس لئے جاؤ اس سے کہہ دو کہ میرے اوپر اپنا جادو ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ میرا دل اک پارۂ سنگ ہے اور نسوانی سحرکاریوں کی دسترس سے بالاتر!"

قلوپطرہ نے اپنے قصر کے دروازے ہر چہار طرف سے بند کرا لئے ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ اب وہ کس تدبیر میں مصروف ہے۔ اکیٹولیس جس نے جواب کے لئے صرف ایک رات کی مہلت دی تھی، صبح ہوتے ہی اپنی سپاہ لے کر آتا ہے اور قصر کے اندر فتحمندانہ داخل ہوتا ہے کہ وہ قلوپطرہ کے حسین ہاتھوں میں زنجیریں ڈال کر باہر لائے گا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب وہ فرش پر قلوپطرہ کو بیہوش پڑا ہوا دیکھتا ہے۔ اس حال میں کہ اس کے عریاں سینے پر اک چھوٹا سا سانپ لہرا رہا ہے اور اس قدر سرشاری کے ساتھ کہ باوجود تمام ہنگاموں کے وہ اپنے دانت قلوپطرہ کے سینہ سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔

یوروپ کی اک حسین راہبہ

نویں صدی کی ابتدا میں جب شارلمین نے سیکسن قوموں کو مطیع کیا تو انہیں عیسوی مذہب اختیار کرنے پر بھی مجبور کیا۔ اور سرزمین انگلستان سے بڑے بڑے مذہبی علماء بلا کر ان کی تعلیم کے لئے مقرر کئے۔

انھیں رہبانوں میں ایک رہبان ایسا تھا جو اپنی حسین رفیق زندگی کو بھی ساتھ لایا تھا اور اپنی ذہانت و قابلیت کی وجہ سے ایک مخصوص امتیاز کا مالک تھا۔ یہاں پہنچنے کے چند دن بعد اس خاتون کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام جون رکھا گیا۔

چونکہ جون کے والدین خود نہایت حسین اور قابل تھے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کی بچی جو ہر چند تعلق محبت کا ناجائز نتیجہ تھی، ان آثار کو لے کر پیدا نہ ہوتی جو ماں کے حسن اور باپ کی ذہانت کی وجہ سے اس کو ملنے چاہئے تھے۔

جون جس قدر زیادہ بڑھتی جاتی تھی، لوگوں کو یقین ہوتا جاتا تھا کہ وہ نہ صرف حسن و جمال بلکہ اپنی فراست و ذہانت کے لحاظ سے بھی بے نظیر ثابت ہوگی۔

اس کے باپ نے ان تمام آثار کو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ اس کو تمام علوم متداولہ کی تعلیم دینا چاہئے۔ تاکہ جمالِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت سے بھی وہ محروم نہ رہے۔

جون نے نہایت قلیل زمانہ میں ایسی ترقی کی کہ اس عہد کی یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے عالم اس کے سامنے گفتگو کرتے پس و پیش کرتے تھے۔ اس کی عمر ابھی صرف تیرہ سال کی تھی کہ وہ مجمع عام میں نہایت دقیق مسائل پر آزادانہ تنقید کرتی تھی اور جرمنی، اطالیہ اور انگریزی زبانوں میں نہایت برجستہ اور حد درجہ بلیغ خطبہ دیتی تھی، پھر ظاہر ہے کہ ایک نوجوان لڑکی جو اپنی تمام ظاہری رعنائیوں اور حسن و جمال کے ساتھ اس قدر کمال علم بھی رکھتی ہو، وہ دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکتی اور فطرت کے اس اعجاز سے وہ کون سا انقلاب ہے جو عالم میں برپا نہیں ہو سکتا۔

رفتہ رفتہ اس کے حسن و رعنائی کا چرچا ہر محفل میں ہونے لگا اور رومی آمینس کی تمام نوجوان آبادی پروانہ وار اُن جلسوں میں کھنچ کھنچ کر آنے لگی، جہاں یہ جمیل راہبہ اپنے نازک لبوں سے نکلنے والے الفاظ کا جادو لوگوں پر ڈالا کرتی تھی۔ جس وقت وہ اپنی نازک کشیدہ قامتی کے ساتھ اسٹیج پر تقریر کرنے کے لئے کھڑی ہو جاتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ صبح بہار نے جسم اختیار کر لیا۔ اور جب وہ اپنی شیریں تقریر کی ابتدا کرتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ بلبل کسی کنج کے اندر نغمہ سرائی میں مصروف ہے اگر ایک طرف اس کی ہر ہر ادا اپنے لئے ایک نئی جان طلب کرتی تھی تو دوسرے طرف اس کا ہر ہر لفظ نطق مسیح ہو کر نکلتا تھا۔ اور اس طرح گویا وہ لوگوں کی موت و حیات پر حکمرانی کر رہی تھی۔

وہ لوگوں کی اس تباہی و بربادی کو دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی، نوجوانوں کے اضطراب و بے تابی کو محسوس کرتی تھی اور اپنے عشوہ و ناز کو اور زیادہ تاب دیتی جاتی تھی۔ آخر کار کیوپڈ جو اس کے "خمیازۂ چشم پُرافسوں" اور "نگاہ جراحت پیشہ"

سے تیر وکمان کا کام لے رہا تھا، تھک گیا اور اب وقت آیا کہ وہ اپنے طلائی پیکاں سے اس کے دل کو بھی زخمی کر دے۔ چنانچہ اس نے فلڈا کے ایک نوجوان راہب کی نگاہوں کو منتخب کیا اور اس سے محبت کا ایک نوش لے کر جس میں ایک نہایت تیز نیش پنہاں تھا۔ جون کو ہنستے ہنستے اک دن پلا دیا اور رخصت ہو گیا۔

فلڈا کا راہب نہ صرف حسن و جوانی کی مکمل تصویر تھا بلکہ اپنے فضل و کمال کے لحاظ سے بھی ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے جون کا اس طرف کھنچ جانا بالکل فطری بات تھی۔ چنانچہ اس نے راہب کے لئے اپنی آغوش کھول دی، اور راہب نے بھی جس کے دل میں جون کی محبت کی پھانس عرصہ سے چبھ رہی تھی اپنے آپ کو اس کے آغوش میں سونپ دیا۔

چونکہ جون نہایت ہی بلند عزم اور مضبوط ارادہ کی لڑکی تھی۔ اسلئے وہ دنیا کی دوسری عام لڑکیوں کی طرح محبت میں گھل گھل کر جان دے سکتی تھی وہ شرم و حیا پر اپنی آرزوؤں کی قربانی نہ چڑھا سکتی تھی۔ اس نے ایک دن راہب کو بلایا اور خاموشی مردانہ لباس پہن کر اس کے ساتھ چل دی۔

اس کے بعد اہل می امینس کو پتہ نہ چلا کہ جون کہاں گئی اور اہل فلڈا کو صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ وہاں کے خانقاہ میں اک نئے نوجوان راہب کا اضافہ ہو گیا ہے جو حال ہی میں انگلستان سے آیا ہے۔

کامل دو ماہ تک یہ دونوں فلڈا کی خانقاہ میں اپنی مدہوش زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن جب بعد کو وہ جوانی کی اس پہلی نیند سے جاگے تو انھیں معلوم ہوا کہ اب خانقاہ کی دیواریں اس راز کو نہیں چھپا سکتیں اور ان کی حیات معاشقہ کا افسانہ اب عام ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ جوآن جو دو ماہ قبل دوشیزگی کی حالت میں یہاں آنے کی جسارت کر سکتی تھی اب اک عمر رسیدہ خاتون میں تبدیل ہو جانے کے بعد اس جگہ کو آسانی سے چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اس لئے اس نے رات کی خاموشی میں اس سر زمین کو خیرباد کہا اور اپنے محبوب کو ساتھ لے کر مردانہ لباس میں ایتھنز پہنچی، جو اس وقت بھی علوم و فنون کا مرکز تھا۔

جوآن نے یہاں پہنچکر بھی اپنے اکتسابات علمیہ کی نمائش کی اور چند دنوں میں ان دو نو وارد راہبوں کی شہرت عام ہوگئی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بعض غیر معلوم اسباب کی بناء پر ان دونوں نے باہمی جدائی گوارا کر لی اور فلڈا کا راہب، سرزمین مشرق کی طرف، اور جوآن مغرب کی جانب چل دی۔

فلڈا کا راہب مصر پہنچا اس نے یہاں اسکندریہ کی سیر کی، سواحل نیل کے مناظر دیکھے، اہرام مصر اور ابوالہول کی زیارت کی۔ سرزمین دمشق و فلسطین کی سیاحت کر کے ان کے آثار علمیہ سے استفادہ کیا، تہذیب بابل کے افسانے پڑھے اور تمام ان آثار کے مطالعہ میں اپنا وقت صرف کیا جن کی مسماریاں اب بھی تہذیب شرق کی داستانیں دوہراتی رہتی ہیں۔

ادھر جوآن سیدھی روم پہنچی جو اس وقت عیسوی اقتدار کا مرکز تھا اور چونکہ ریش و بروت صاف رکھنا اس عہد کی تہذیب تھی اس لئے جوآن کو اپنے تئیں مرد ظاہر کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

اس وقت بینیڈکٹ ثانی مذہب عیسوی کے تخت کا فرمانروا تھا اور ہر چند روم خانہ جنگی، ہنگامہ آرائی اور باہمی مخالفت کا شکار ہو رہا تھا تاہم وہ قدیم

تہذیب کا جولانگاہ تھا، علوم و فنون وہاں کی فضا میں بسے ہوئے تھے اور خانقاہ علماء و فضلاء سے معمور نظر آتی تھی۔

پھر دریائے ٹائبر پر واقع ہونے والا وہ شہر جس کا ایک ایک ذرہ قیصر آگسٹس کے افسانہائے اولوالعزمی سے معمور تھا۔ کیونکر جون ایسی حوصلہ مند عورت کو مایوس کر سکتا تھا۔ چنانچہ جون نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنے لئے یہاں وہ مستقبل پیدا کرنا ہے جو صفحات تاریخ پر ہمیشہ کے لئے منقوش ہو جائے اور اپنی ہستی کو اس روشنی میں پیش کرنا ہے جو حوادث زمانہ سے کبھی گل نہ ہو۔

آخر کار وہ ایک خانقاہ میں داخل ہوئی اور نہایت قلیل عرصہ میں اس نے اپنے فضل و کمال، اپنی فصاحت و بلاغت اپنی سادہ معاشرت اور سب سے زیادہ اس مخفی کہربائیت سے، جو ایک پرشباب نسائیت کا جزو لاینفک ہے۔ سارے روم کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ بڑے بڑے علماء، امراء، قسیس و رہبان اسکے پاس آتے تھے اور جب لوٹتے تھے تو بالکل مسحور و مفتون، وہ غور کرتے تھے کہ انگلستان کے اس نوجوان راہب میں وہ کون سی بات ہے جو ان کے دلوں کو اپنی طرف جذب کئے لیتی ہے، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھ سکتے تھے۔ کہ شاید یہ روح القدس کے فیضان اور معصومیت مسیح کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

شہر روم سے باہر اس وقت ایک خانقاہ سنٹ مارٹن کے نام سے منسوب تھی، جہاں علوم مذہب اور فنون ادب کی تعلیم یونانی اور لاطینی زبان میں دی جاتی تھی۔

جون ایک راہب کی حیثیت سے اس میں داخل ہو گئی اور اپنے عالمانہ

خطبات نے روم کے تمام قرب وجوار میں ہنگامہ پیدا کر دیا۔ وہ یہاں اسطرح اکتساب شہرت میں مصروف تھی کہ برجیس (یا پائے اعظم) کا انتقال ہوا اور اسکی جگہ پوپ لیو چہارم کا انتخاب عمل میں آیا جو سنٹ مارٹن کالج میں جوآن کی ہستی سے آگاہ ہو چکا تھا اور اس کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔

اس نے بعض اہم اور مخفی خدمات بھی جوآن کے سپرد کیں جنہیں اس نے نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا اور اس طرح اس کا اقتدار دین مسیحی کے اس قوی ترین علمبردار کے دربار میں بڑھتا گیا۔ کیونکہ جوآن نے مملکت روم، پاپائے اعظم اور مذہب کی امداد میں محض اپنی قابلیت علمی ہی صرف نہیں کی تھی بلکہ اس نے ایک مرتبہ سپاہ روما کی قیادت کرکے دشمنوں سے جنگ بھی کی تھی اور کامیاب ومظفر ہوکر واپس آئی تھی۔

اسی کے ساتھ جوآن اپنی نسوانی ذہانت کی وجہ سے تمام اکابر قوم، امرا ملک اور پیشوایان مذہب کے ایسے بہت سے رازوں سے واقف ہوگئی جو ان کی نہایت ہی ذلیل کمزوریوں سے متعلق تھے اور اس سلسلہ میں کارڈنل لیو کی بھی (جو اس وقت تک سکریٹری آف اسٹیٹ تھا) رازدار ہوگئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب برجیس کی وفات پر کارڈنل لیو، پاپائے اعظم بنایا گیا تو جوآن اس کی جگہ پر سکریٹری آف اسٹیٹ بن گئی۔

اس وقت اناسٹیس جو وہاں کا کارڈنل تھا لیو کا سخت دشمن تھا۔ اس نے جدید پوپ کو تکلیف پہنچانے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اناسٹیس جلاوطن کر دیا گیا۔ مگر پوپ ہنوز اپنا انتقام نہ لے چکا تھا، وہ باقاعدہ اس پر لعنات

کا جرم ثابت کر کے اس کا عہدہ بھی اس سے چھین لینا چاہتا تھا۔ اس مسئلہ میں جوآن نے اس کی بہت مدد کی کیونکہ مجلس فیصلہ کے سامنے جو بیان اناسٹیس کو ملزم قرار دینے کے لئے پیش کیا گیا تھا وہ جوآن ہی کا مرتب کیا ہوا تھا اور جس میں اس نے اپنی ساری قابلیت صرف کر دی تھی آخرکار اناسٹیس اپنے عہدہ سے معزول کیا گیا اور جوآن اس کی جگہ کارڈنل مقرر کی گئی۔ یہ اتنی بڑی عزت تھی جس کی تمنا کرنا گویا سلطنت کی آرزو کرنا تھا۔ لیکن جوآن جس کی پرواز فکر اس سے زیادہ بلندی کی متمنی تھی، ہنوز مطمئن نہ تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ میں ساری دنیا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہوں اور یہ مقصد آفرینش بہر نوع پورا ہو کر رہے گا۔

اتفاق سے اس واقعہ کے چند ہی دن بعد لیو (پوپ) دفعتاً مر گیا اور جدید پوپ کے انتخاب کا وقت آیا۔ یہ زمانہ نہ صرف روما بلکہ تمام مسیحی دنیا کے لئے نہایت سخت اضطراب و تشویش کا تھا۔ کیونکہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ جدید پوپ کس خیال کا شخص ہوگا اور وہ اس وقت کی سیاسی پیچیدگی میں کس ملک کا مددگار ثابت ہو۔

اس جگہ کے لئے متعدد امیدوار تھے، جن میں سے ہر ایک نے اسقف اعظم کا تخت و دیہیم حاصل کرنے کے لئے پوری طرح خون بہایا، لیکن فطرت کی نگاہ انتخاب جس پر پڑ چکی تھی وہ کوئی اور تھا۔

جب یہ باہمی جنگ و قتال حد سے بڑھ گیا تو فیصلہ یہ کیا گیا کہ موجودہ امیدواروں میں سے کسی کو یہ خدمت نہ سپرد کی جائے بلکہ ایک ایسا شخص پوپ بنایا جائے جس کا تعلق ان متخاصم جماعتوں میں کسی سے نہ ہو چنانچہ جوآن، جو می امنیس کی ایک معمولی لڑکی تھی جوآن ہشتم کے نام سے تخت مسیحیت پر جلوہ افروز ہو گئی۔ 2

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوآن کو پوپ بنانے میں صرف مصلحت سے کام لیا گیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ سارا روم پہلے ہی سے اسکا طرفدار تھا اور لیو کے مرنے کے بعد ہی لوگ جوق در جوق آتے تھے اور قصر پاپا کے دروازے پر آ کر نعرہ لگاتے تھے کہ "زندہ باد پوپ جون ہشتم" جوآن کے نازک قدموں کے نیچے لوگوں نے پھول بچھائے۔ اور جب وہ لیو کے جنازہ کے ساتھ باہر آئی تو تمام امراء روم نے اپنے قیمتی ملبوس اور زرکار چادریں اس کے راستہ میں فرش کر دیں۔

جوآن سے قبل اور اس کے بعد بہت سی عورتوں نے حکمرانی کی، سمیرامس سے لے کر کیتھرائن تک ملکہ زنوبیا سے لے کر الزبتھ تک متعدد عورتوں نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی، بہت سے افراد جنس نازک کے ایسے ہوئے جنھوں نے معاشری، سیاسی اور علمی دنیا میں اپنا اقتدار قائم کر لیا، لیکن عالم مسیحیت پر فرمانروائی کرنا جنت کی کنجیوں کا مالک ہو جانا۔ زمین کی طرح آسمانی حکومت کو بھی اپنے قبضہ میں کر لینا یہ دنیا میں صرف ایک ہی عورت کا مقسوم تھا۔ جسے روم والوں نے عرصہ تک مرد ہی یقین کیا۔

پوپ جوآن نے اس قدر قابلیت سے اپنی خدمات انجام دیں کہ ساری عیسوی دنیا نے اعتراف کیا بہت سے مذموم مراسم مٹ گئے اقتصادی حالت درست ہو گئی اور پاپا کا وہ خزانہ جو عربوں کے حملہ کی وجہ سے خالی ہو گیا تھا پھر معمور ہو گیا۔ بڑے بڑے بادشاہ آ کر سربسجود ہونے لگے ملک کا اعاظم و اکابر آستانہ بوسی کے لئے حاضری دینے لگے۔ اور تمام وہ دنیاوی جاہ و جلال جو دنیا میں ایک

انسانی ہستی کو میسر آسکتا ہے جون کے قدموں پر ڈال دیا گیا۔

(۲)

ایک مرد جب عیش و نشاط، جاہ و ثروت، دولت و حکومت کے عروج پر جاتا ہے تو اس کے دل سے احساس محبت مٹ جاتا ہے۔ لیکن عورت خواہ کتنی ہی دنیاوی ترقی کیوں نہ کر جائے۔ عورت ہی رہتی ہے اور اس کے جذبات لطیف معدوم نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ وقت آیا کہ جون اپنی موجودہ حالت سے بیزاری محسوس کرنے لگی اور اپنی نسائیت سے مغلوب ہوگئی، دنیا اس کی اطاعت کرتی تھی۔ عالم اس کی پرستش کرتا تھا، لیکن اب وہ اس کے لئے بیتاب تھی کہ کوئی اس سے محبت کرے اور ان جذبات کو سکون پہنچائے جن کا جواب دینے کے لئے اس وقت وہ سارے عالم کو ویران پاتی تھی۔ وہ عورت سے مرد کیا بنی کہ تمام دنیا اس کے لئے عورت ہو کر رہ گئی۔

اول اول جب وہ روم آئی تو اس نے سوائے مطالعہ کے کسی چیز سے سروکار نہ رکھا۔ جب وہ رفتہ رفتہ پوپ کے درجے تک پہنچی، تو پھر بھی کچھ عرصہ تک وہ اسی مشغلہ میں مصروف رہی۔ لیکن چند دن گذرنے کے بعد اسے وہ ایام گذشتہ یاد آنے لگے جب فلڈا میں وہ اپنے محبوب راہب کی معیت میں سرشار رہتی تھی اور دنیاوی عروج کی تلخیوں سے ناآشنا تھی۔

ہرچند اس کے چاروں طرف مردوں کا ہجوم رہتا تھا۔ بڑے بڑے حسین نوجوان اس کے سامنے زمین بوس ہوا کرتے تھے۔ لیکن وہ آزادی سے کسی کا انتخاب نہ کر سکتی تھی کیونکہ اسے ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو حد درجہ قابل اعتبار ہو اور اس کے

رازکو کسی پر ظاہر نہ ہونے دے۔ وہ سوچتی رہی، ایک ایک نوجوان کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتی رہی اور آخر کار اس کے دل نے ایک شخص بالڈو کا انتخاب کرلیا۔ یہ جوان فلارنس کا رہنے والا تھا اور راہب فلڈا سے صورتاً بہت مشابہ تھا، جون نے اسے اپنا حاجب مقرر کیا اور رفتہ رفتہ اس پر اپنا راز ظاہر کرکے اس کی محبت حاصل کرلی۔

اس کے بعد جون زیادہ تر خلوت میں بسر کرنے لگی۔ جس کی تاویل لوگوں نے یہ کی کہ وہ کسی خاص عبادت میں مصروف ہے۔ بیشک وہ عبادت میں مصروف تھی اور وہ عبادت بالڈو کی حسین صورت کی تھی۔ وہ پرستش خود اپنے ہی جذبات شباب کی تھی وہ اس وقت وینس تھی اور بالڈو، اڈونس، وہ تشنہ تھی اور بالڈو چشمۂ آب، یعنی وہ اس وقت حقیقی معنی میں ایک عورت تھی اور بالڈو صحیح معنی میں ایک مرد۔

چند ماہ بھی جون کو شراب محبت سے کیف اندوز ہوئے نہ گذرے تھے کہ فطرت نے اپنا انتقام لینے کی تدبیریں شروع کردیں یعنی اس نے محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہے۔ یہ خبر بالڈو کے لئے اس قدر وحشت خیز تھی کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کرلیا اور شاید وہ اس ارادے کو پورا کردیتا اگر جون اسے باز نہ رکھتی۔ اس میں شک نہیں کہ خود جون بھی ایک حد تک مضطرب تھی۔ لیکن اس نے خیال کیا کہ اگر اس کے بچہ ہوا بھی تو وہ اسے بالکل اسی طرح معجزہ کی صورت میں ظاہر کرے گی جس طرح مسیح کی ولادت بغیر باپ کے تسلیم کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس وقت تک لوگوں کی توہم پرستی بدستور قائم تھی اور جون نے خیال کیا کہ جو قوم علم الاصنام کے مزخرفات پر مذہبی حیثیت سے اس قدر راسخ الاعتقاد ہے اور اسکے

لئے یہ باور کر لینا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ روح القدس نے ایک مرد پوپ کے بطن سے بچہ پیدا کر کے اپنے معجزہ کو دوبارہ دنیا میں ظاہر کیا۔

لیکن وہ اسی فکر میں مبتلا تھی کہ دفعتاً فلڈا کا وہ راہب جو کسی وقت اس کا محبوب رہ چکا تھا اور جس کے متعلق اسے یقین تھا کہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ روم آیا اور یہ معلوم کر کے کہ انگلستان کا رہنے والا جون پاپائے اعظم ہے۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب یہ راہب روم آیا تو اس نے کسی راہب سے دریافت کیا کہ تمھیں کسی باشندۂ انگلستان جون کی بھی کچھ خبر ہے۔ اس نے نہایت حیرت سے کہا کہ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آج کل وہی دُنیائے مسیحیت کا حکراں ہے۔ بارہ سال کا زمانہ ہوا جب وہ یہاں آیا اور اپنے فضل و کمال سے اس مرتبہ پر پہنچ گیا۔ اول اول تو اس نے اپنے خدمات حد درجہ قابلیت سے انجام دئے۔ لیکن اب حالت وہ نہیں ہے اور اس کا ایک حاجب اس پر اسقدر حاوی ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ اس کا بیٹا یا کوئی اور قریب کا عزیز ہے، اور بعض اور خدا جانے کیا کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب تک کسی کو صحیح حال نہیں معلوم ہو سکا۔

فلڈا کے راہب نے یہ سُنا اور صبح کو قصر پاپا پر پہنچ کر اطلاع کرائی کہ ایک باشندۂ انگلستان نہایت ضروری کام سے ملنا چاہتا ہے۔ جون یہ سنتے ہی چونک پڑی اور جب فلڈا کا راہب اس کے سامنے آیا تو اس پر بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ ایسی ہی ناخوشگوار تھی جیسی ایک

ناکام دمجبور چاہنے والے کی کامیاب رقیب کے مقابلہ میں ہونی چاہئے۔ لیکن اس نے ان جذبات کا اظہار نہیں کیا، البتہ اس پر سخت لعنت ملامت کی کہ اس نے دنیا کو کس قدر فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور عورت ہو کر محض اپنے مکر سے اس جگہ کو غصب کئے ہوئے ہے، جہاں کوئی عورت نہیں پہنچ سکتی۔

اس راہب کے چلے جانے کے بعد جون کے انکار میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا اور اس نے ارادہ کیا کہ اپنے محبوب حاجب کو لے کر رات کی تنہائی میں کہیں چلی جائے۔ جس طرح وہ فلڈا سے بھاگی تھی، لیکن جاہ و ثروت و دولت و حشمت کی وہ اس درجہ خوگر ہوگئی تھی کہ ان کا ترکِ خیال اس کے لئے سوہانِ روح ہوگیا اور آخر کار صرف اپنی تدبیر و ذہانت پر اعتماد کر کے مستقبل کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ ہوگئی۔

اتفاق سے اسی زمانے میں دریائے ٹائبر میں سیلاب آیا، جس نے ہزاروں خاندانوں کو تباہ کر دیا، اور اس کے ساتھ ہی ٹڈیوں نے شہر پر حملہ کیا جس سے تمام آبادی بدحواس ہوگئی اور فصلیں غارت ہوگئیں جب یہ حالت ناقابلِ برداشت ہوگئی اور لوگ سخت مضطرب ہوئے تو پاپائے اعظم کے قصر پر پہنچے۔ تاکہ وہ اپنی دُعا سے ان بلاؤں کو دور کر دے، چنانچہ جون اپنے محبوب حاجب کے کہنے سے بالاخانہ پر آئی اور اس نے اپنا نازنین و مقدس ہاتھ بلند کر کے لوگوں کو دعا دی اور کہا کہ "کل ایک جلوس کے ساتھ باہر نکل کر شہر روم سے اس بلا کے دور ہونے کی دُعا کروں گا۔"

روم کی رعایا حد درجہ باطل پرست تھی۔ اس وعدے سے مطمئن ہو کر

چلی گئی۔ دوسرے دن سارے روم میں ہلچل مچی ہوئی تھی، کلیساؤں کے گھنٹے بج رہے تھے۔ تمام امراء، راہب اور قسیس قصر پاپا میں جمع تھے بخور کا دھواں چاروں طرف چھایا ہوا تھا، مذہبی گیتوں سے فضا معمور ہو رہی تھی۔ راستوں پر زر کا فرش پاپا کے گذرنے کے لئے بچھایا جا رہا تھا صلیبیں بلند کی جا رہی تھیں کہ جون اپنے محل سے نکلی اور اہل روم کے ہجوم میں اس کا جلوس برآمد ہوا۔ دعائیں مانگی گئیں۔ برکات آسمانی کے لئے ہاتھ پھیلائے گئے۔ آفات سے بچنے کیلئے التجائیں پیش کی گئیں اور اس طرح جون مطمئن و مسرور اس ہجوم سے واپس آنے لگی لیکن عین اس وقت جبکہ وہ اپنے مقدس خچر پر سوار ہو رہی تھی۔ فطرت نے اپنی امانت طلب کی۔ جون غش کھا کر زمین پر گر پڑی اور لوگوں نے دیکھا کہ ایک ننھا سا بچہ بھی وہیں موجود ہے۔

ہر چند جون کے حاجب نے بہت کوشش کی کہ اس کو معجزہ کی صورت میں پیش کرے لیکن چونکہ جون کے بہت سے مخالف بھی ہو گئے تھے اس لئے اس معجزہ کو کسی نے تسلیم نہیں کیا اور ایک عام حیرت واستعجاب کے ساتھ حد درجہ برہمی لوگوں میں پھیل گئی کیونکہ اب جون کا عورت ہونا سب پر ظاہر ہو گیا تھا اور اس خیال سے کہ اس وقت تک ایک عورت (جو بدترین مخلوق سمجھی جاتی تھی) تخت مسیح پر قابض رہی، غیظ و غضب انتہائی حدود تک پہنچ گیا اور آخر کار جون یورپ کی وہ سب سے زیادہ حسین و مشہور راہبہ جس کے مرتبہ تک کوئی عورت نہیں پہنچ سکی تھی معہ اپنے بچہ کے سپرد خاک کر دی گئی۔

ایک خائن ملکہ

جوزیفائن ، دغا باز جوزیفائن شہر میلان میں اپنے قصر جمیل کے اندر بیٹھی ہوئی تھی۔ یعنی جس وقت اس کا شوہر نپولین اطالیہ کے ساتھ مصروف کارزار تھا اور اپنے وطن کا جھنڈا مقدس سرزمین پر نصب کرنے کے لئے دشمن پر ایک آخری کاری ضرب لگانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ اس کی ملکہ اپنے قصر میں عیش وعشرت کے مزے لوٹ رہی تھی، وہ شہر کے اشراف و اعیان کے ساتھ تماشہ گاہوں تھیٹروں اور رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتی اور ہر شخص ملکہ کے قدموں پر ارادت وعقیدت کے پھول نثار کرنے کو انتہائی سعادت سمجھتا لیکن یہ تمام سامان عیش و مسرت اس کو مسرور رکھنے کے بجائے کچھ اور زیادہ حزیں و ملول بنا دیتے کیونکہ جب وہ رقص و سرود کی محفلوں میں عشق و محبت کے جنوں خیز نغمے سنتی تو اس کے جذبات محبت برانگیختہ ہو جاتے۔ اس کے دل کی بجھی ہوئی آگ ایک بار پھر مشتعل ہو جاتی اور اسے کوئی ایسا شخص نہ ملتا جس کے سامنے وہ اپنا دل نکال کر رکھ دیتی جس کے سامنے وہ اپنے گرم آنسوؤں کی بارش پیش کرتی اور جو اسے اپنی آغوش میں لے کر اس کے جلتے ہوئے سینہ کی آگ بجھاتا۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے کمرے میں متفکر و پریشان ادھر سے ادھر ٹہلا کرتی

اس کے تاریک گوشوں میں اس بہادر انسان کو تلاش کیا کرتی جو اس کے نحیف و دراز جسم کو اپنے پہلو میں جگہ دے کر اس کے عشق کی بھڑکتی ہوئی چنگاریاں بجھائے۔ لیکن نپولین دور تھا اس لئے اس کی جگہ ایک دوسرے فوجی نوجوان نے لے لی۔ اور اس کی امانت پر ایک دوسرے شخص نے قبضہ کر لیا۔

(۲)

جوزیفائن نے اپنے محبوب شارل کو بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا۔ شارل خط پڑھتے ہی نہایت تیزی کے ساتھ قاصد کے ہمراہ ہو لیا اور میلان پہنچکر جوزیفائن کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ عاشق و معشوق دونوں بیٹھ کر شراب و کباب کے مزے لینے لگے۔ جوزیفائن نے اپنے ہاتھ سے جام شراب بھر کر شارل کو پیش کیا، پھر خود اسی آتش سیال سے اپنے قلب سوزاں کو تر کیا۔ جوزیفائن نے شراب ناب اور شراب محبت سے مخمور ہو کر اپنے محبوب کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ حجابات کا پردہ اٹھ چکا تھا کہ شارل نے اس سے پوچھا، ملکہ کیا آپ میلان میں خوش نہیں یہاں کی مخلوق تو آپ پر جان نثار کرنا اپنا فخر سمجھتی ہے۔ آپ کے ایک نظارہ پر باشندگان میلان دین و دل نثار کرنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں آپکے ایک اشارۂ ابرو پر ان کا ہر ہر فرد آپ کے قدموں پر جھکنے کے لئے تیار ہے"۔ جوزیفائن نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا "نہیں، پیارے شارل نہیں، یہ مجھے دیکھنے کے لئے میرے دیدار کے لئے جمع نہیں ہوتے، یہ تو ملکۂ جوزیفائن کے لئے نہیں بلکہ اپنے فاتح کی بیوی کی زیارت کے لئے مجتمع ہوتے ہیں۔ میری تکریم، میری قدر، میری محبت صرف پیرس میں ہوتی ہے۔ وہ پیرس جو کعبۂ عشاق ہے

جو قبلۂ اہلِ دل ہے۔ جو زیارت گاہِ حسن ہے۔ وہاں میری اور صرف میری درگاہِ جمال ہیں کشتگان محبت اپنی جراحتوں کا مرہم تلاش کرتے ہیں، وہاں میری قربان گاہ حسن پر دل دادگانِ محبت اپنے دین و دل قربان کرتے ہیں میرے ہی حضور میں عشاق سجدۂ نیاز ادا کرتے ہیں کتنے پجاری مجھے حسن کی دیوی سمجھ کر پرستش کرتے ہیں۔ لیکن یہاں تو میں صرف نپولین کی ملکہ ہوں۔ فاتح اعظم کی بیوی ہوں رہ گیا میری زیارت کے لئے لوگوں کا گلیوں اور راستوں میں جمع ہونا۔ مجھے دیکھ کر نعرہ ہائے مسرت بلند کرنا یہ سب بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک کمزور و ناتواں انسان اپنے سے قوی تر اور صاحب اقتدار انسان کی خوشامد میں اپنی نجات دیکھتا ہے۔ میں ان کے نزدیک ایک متخیلہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، جس کے اندر یہ اپنے مظفر و منصور بہادر کی شبیہہ دیکھتے ہیں۔ اس لئے یہ تکریم و تعظیم یہ اظہار مسرت و محبت درحقیقت بحیثیت ایک عورت کے نہیں ہے۔ میری یہ ساری تعظیم و تکریم دراصل نپولین کی تعظیم و تکریم ہے۔ اس لئے پیارے شارل میں اس سے گھبرا اٹھی ہوں اور کسی نہ کسی طرح میلان کی اس زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ایک دن میں کسی دعوت میں شریک تھی کہ میرے پاس ایک شخص آیا اور مجھ سے نہایت پر لطف اور دلآویز باتیں کہنے لگا۔ میں یہ محسوس کرتی تھی کہ میری آنکھیں جب کبھی اس سے دوچار ہوجاتی ہیں تو وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ میرے ہاتھوں سے جب کبھی اس کا ہاتھ مس ہوتا ہے تو اس میں رعشہ کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے یکایک اس کے لہجہ میں تغیر پیدا ہونے لگا۔ اس کی باتوں کا رخ بدل گیا۔ عشق و محبت کی شیریں اور پرکیف گفتگو کے بجائے

وہ اپنے فاتح اعظم کی تعریف و توصیف کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یکایک میری آنکھوں میں اس نے کوئی خونخوار اور خوفناک شیر دیکھ لیا تھا جس سے ڈر کر وہ مجھ سے جدا ہو گیا۔ لیکن میرا قلب اب تک اس کی ان محبت آمیز باتوں کا پیاسا ہے۔ اس وقت شارل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کے لمبے لمبے سنہرے نرم بالوں سے کھیلتے ہوئے محبت کے نرم و شیریں لہجے میں جس سے آتش محبت اور بھڑک اٹھتی ہے، کہنا شروع کیا۔ "پیاری ملکہ! آپ ان معمولی باتوں کا خیال نہ کریں آپ کے یہ نرم و نازک رخسار، یہ سپید مرمریں سینہ، یہ بھرے بھرے بازو، یہ سحر آفریں آنکھیں، بوناپارٹ کی تلوار سے کم نہیں۔ جنرل کی خونچکاں تیغ صرف ملکوں پر قبضہ کر سکتی ہے لیکن آپ کا گوہر فشاں تبسم لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکتا ہے۔ آتشیں گولے شہر و ملک کو جلا کر خاکستر کر سکتے ہیں لیکن آپ کا یہ برق تبسم تو خرمن دل کو پھونک سکتا ہے۔ آپ کے حسن کی فتحیابی تلوار کی فتحیابی سے زیادہ کامیاب ہے۔" شارل ۱۳؍جنوری ۱۹۲۷ء کی شام کو بیٹھا ہوا ملکہ جوزفائن سے عشق و محبت کی یہ باتیں کر کے اپنے اس قائد اعظم کے حق میں خیانت کا ثبوت دے رہا ہے جو میدان جنگ کی ہیبت ناک فضا میں اپنے عزیز وطن کے لئے خون کی ندیاں بہا رہا تھا۔

(۳)

اسی رات جب نپولین بوناپارٹ اپنے آئندہ حملوں کے متعلق اسکیم تیار کر رہا تھا۔ دفعتاً اس کے دل میں خیال گذرا کہ اس وقت جب میں میلان سے بہت قریب سفر کر رہا ہوں کیوں نہ دو گھنٹے بچا کر میلان بھی ہوتا آؤں اور اپنی

محبوب بیوی سے مل آؤں۔ نپولین محل کے دروازے پر پہنچا۔ سامنے ہی ایک غرفہ تھا جہاں سے روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ وہ دیوار پر چڑھا اس کے سہارے جنگلے پر پہنچا۔ اور روشن دان کی راہ سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر اس پر ایک بجلی سی گر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی محبوب ملکہ جسے وہ دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ فوج کے ایک سپاہی سے مصروف التفات ہے نپولین غصہ سے بے قابو ہو گیا اور ارادہ کیا کہ اپنی تلوار سے اس غدار دغاباز کا سر تن سے جدا کر دے۔ لیکن پھر سنبھل گیا اور جب نپولین کو بالکل سکون ہو گیا اور اس کے حواس کچھ درست ہوئے تو وہ شارل کے قریب گیا اور کہا، "شارل! کیا تیرے لئے میلان میں کوئی دوسری عورت نہ تھی جس سے تو اپنی ہوس پوری کرتا کیا تیرے لئے صرف اسی جنرل کی بیوی رہ گئی تھی جو اپنے ملک و وطن اور تجھ جیسے بزدل انسانوں کی جان بچانے میں مصروف بیکار رہتا ہے۔" شارل نے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور جواب دینے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ نپولین نے ڈانٹ کر کہا، "خاموش! اے خائن خاموش، وہ سپاہی جس میں کچھ بھی غیرت اور خودداری ہوتی ہے وہ عورتوں کے پاس بیٹھنے سے اس کو بہتر سمجھتا ہے کہ میدان حرب میں جان دیدے۔ تو فوراً لشکر کے دفتر میں جا اور چیف سکریٹری سے کہہ کہ میں نے تجھے دفتر کا منشی بنایا۔ تیری خیانت کے لئے فی الحال یہی سزا کافی ہے"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر نپولین نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا: "میں تیری سپاہیانہ شرافت سے امید کرتا ہوں کہ تو اس واقعہ کو لوگوں تک پہنچانے سے باز رہے گا جس سے ایک جنرل کی عزت و آبرو پر حرف آتا ہے۔"

(۴)

صرف یہ سزا تھی جو نپولین نے اس خاین اور دغا باز کے لئے تجویز کی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ دنیا کی نظروں میں ذلیل اور رسوا ہونے کے لئے تیار نہیں تھا شاسل کے چلے جانے کے بعد نپولین ملول و مغموم ہو کر ایک کرسی پر پڑ رہا۔ تھوڑی دیر بعد جوزیفائن سے یوں مخاطب ہوا "جوزیفائن میں حیران ہوں کہ اس وقت تجھ سے کیا باتیں کروں مجھ میں اس وقت اپنے آپ سے بھی باتیں کرنے کی طاقت نہیں ہے"

افسوس ظالم تو نے پہلے تو مجھے عزت کی سب سے بلند چوٹی پر جگہ دی اور جب میں اس کی بلندی پر آرزوؤں کے شیریں خواب دیکھنے لگا تو تو نے یکا یک مجھے وہاں سے تاریک ترین غار میں گرا دیا تو نے میرے ساتھ وہی کھیل کھیلا جو معصوم بچے، کبوتر اور طوطوں کے ساتھ کھیلتے ہیں، یعنی قدرت ان معصوم جانوروں کی موت و حیات ان بچوں کے ہاتھ میں دے دیتی ہے اور وہ اسے سختی سے اپنی مٹھی میں دبوچ کر اس کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ انھیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ نازک جانیں ہیں جن پر ان کا یہ کھیل تکلیف اور درد کی ہزاروں بجلیاں گرا رہا ہے اور جو ہر سانس کو اپنی آخری سانس اس دنیا میں خیال کرتے ہیں"

جوزیفائن نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی دونوں باہیں نپولین کی گردن میں حائل کر کے معافی کی خواستگار ہو لیکن نپولین نے ہاتھوں کو جھٹک دیا اور کہا :-

جوزیفائن خدا کے لئے محبت کے ذکر سے باز رہ کیونکہ یہ لطیف کلمہ جو روحانی جذبات کی صحیح آواز اور زندگی کے مقدس خوابوں کی صحیح تعبیر ہے، جو بیک وقت

روحانی اور جسمانی خواہشات کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے تمھارے نقطہ نظر سے صرف بہیمی جذبات کے پورا کرنے کا آلہ ہے، تو نے محبت کو حیوانیت کا وہ رتبہ دے رکھا ہے جس سے انسانیت اجتناب کرتی ہے تیرے نزدیک محبت ایک حقیر اور معمولی سودا ہے جو بازاروں میں کوڑیوں کے مول مل جاتا ہے۔ حالانکہ یہی محبت نظام اجتماعی کی اساس ہے اس میں زندگی کی روح پھونکتی ہے۔ اس کی تجلیات حسن وجمال کو دوبالا کرتی ہیں اور تمام لذتوں کا سرچشمہ ہیں۔ کاش تو نے اس نعمتِ حیات کا شکر ادا کیا ہوتا کاش تو نے قدرت کے اس احسان کی قدر کی ہوتی کہ اس نے تجھے حسن وجمال عطا کر کے تمام عالم کے دلوں کا مجازی بنایا ہے لیکن افسوس کہ شیطان نے تیرے دل پر قابو پا رکھا ہے جو کبھی کبھی تیرے ضمیر کی حقیقی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ تیرے دل و دماغ کو غلط راستے پر ڈال دیتا ہے میں اس عورت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو مردہ دل ضمیر فروش، عقل و خرد سے بیگانہ ہو۔ کیونکہ اس وقت عورت اور چڑیل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مجھے اس شخص کے حالِ زار پر رحم آتا ہے جس کے پہلو میں ایسی عورت ہو کیونکہ اس حالت میں وہ دنیا کا سب سے بڑا بدبخت انسان ہے جس کی حیثیت بہایم سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں خوبصورت عورت صرف آنکھوں کو بھاتی ہے۔ لیکن خوب سیرت اور خوش خلق عورت دل میں گھر کر لیتی ہے وہ محض ایک ہیرا ہے مگر یہ پورا دفینہ ہے"

نپولین نے اس وقت اپنے چاروں طرف ایک نگاہ ڈالی اور اٹھ کر تیزی کے ساتھ اسی روشندان کی طرف چلا جہاں سے کچھ پہلے ابھی وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ جوزافین نے چاہا کہ اسے روکے لیکن نپولین نے اس زور سے اُسے

ڈھکیلا کہ وہ زمین پر غش کھا کر گر پڑی اور وہ یہ کہتا ہوا روشندان پر ہو رہا۔
"پیچھے ہٹ او نابکار عورت، پیچھے ہٹ، مجھے تیری محبت سے زیادہ کشش
رکھنے والی ایک دوسری محبت کھینچ رہی ہے۔ تیرے ساتھ بیٹھ کر راز و نیاز کی باتیں
کرنے کے علاوہ دنیا میں کچھ اور فرائض بھی ہیں جو مجھے سرفروشی کی دعوت دے
رہے ہیں۔ میں لڑائی کی آگ میں جلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ وطن کی محبت میرا
خمیر ہے۔ اسے مجھ پر اعتماد ہے اور مجھے اس پر۔ میرے سامنے امیدیں اپنے خوشنما
لباس میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور مجھے کھینچ کر بلند سے بلند مقام پر لے جاتی ہیں اور
یہیں میرا مسکن ہے اور یہی میرا ملجا و ماویٰ ہے!"

زُبیدہ وَعبدالرحمٰن فاتحِ اندلس

جب ۷۵۰ء میں جنگ زاب نے حکومت بنی امیہ کا شیرازہ بالکل منتشر کر دیا اور بنو عباس کی طرف سے ابو مسلم خراسانی کی تلوار خاندان بنی امیہ کے سروں پر چمکنے لگی، تو ان ستم زدگان دولت و حکومت میں سے ایک شخص ایسا بھی تھا جس نے بنو عباس کی تمام آرزوں کو خاک میں ملا دیا اور اندلس پہنچکر ایک ایسی زبردست حکومت اسلامی قائم کی جس پر خاندان عباس نے ہمیشہ رشک کیا اس شخص کا نام عبدالرحمٰن الداخل تھا۔

اس وقت موضوع سخن یہ نہیں کہ عبدالرحمٰن کے اُن واقعات حیات سے بحث کی جائے جو تاریخ میں موجود ہیں اور نہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس نے کیونکر اندلس میں دولت اسلامی قائم کی اور بلاد غرب میں اس کی ذات سے علم و ادب کو کس قدر فائدہ پہنچا کیونکہ اس کی تفصیل تمام تاریخی کتابوں میں ملتی ہے، بلکہ مقصود اس واقعہ کو بیان کرنا ہے جسے مورخین نے ترک کر دیا یعنی یہ کہ کس طرح اس نے موت سے نجات پائی اور کیونکر بنی عباس کے پنجہ سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوا

جس وقت بنو عباس، خاندان بنی امیہ کی گرفتاری میں مصروف تھے، اس وقت عبدالرحمٰن نہر فرات کو عبور کر کے مع اپنے چھوٹے بھائی کے ایک مختصر سے

گاؤں میں پہنچا اور یہاں ایک ایسے شخص کے مکان میں پناہ گزیں ہوگیا جو اس خاندان کا ممنون احسان تھا۔ اس کے ایک لڑکی تھی زبیدہ نہایت جمیل و خوش اندام جس کی عمر ابھی صرف سولہ سال کی تھی جو اپنے باپ کی غیر حاضری میں (جب وہ ذابحے میں مچھلی کے شکار کے لئے جاتا) گھر کا سارا انتظام کرتی۔ عبدالرحمٰن کی عمر بھی اس وقت ۲۰ سال کی تھی۔ وہ بھی نہایت خوبصورت انسان تھا۔

اول دن جب زبیدہ کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔ اسی وقت اس کے دل میں عبدالرحمٰن کی محبت پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن اب کچھ زمانہ کے قیام نے اس جذبہ میں اور زیادہ استحکام پیدا کر دیا تھا۔ وہ نقاب کے نیچے سے، پردہ کی اوٹ سے اور دریچوں کی جھلملی سے اسے دیکھا کرتی اور خاموشی کے ساتھ مدارج محبت طے کرتی جاتی تھی۔

ایک دن زبیدہ پانی لینے کے لئے دریائے فرات کے کنارے گئی تو بائیں ساحل کی طرف دور کی فضا میں بہت سے سیاہ پرچم اس کو متحرک نظر آئے وہ جانتی تھی کہ سیاہ پرچم بنو عباس کا فوجی نشان ہے، وہ اس سے بھی واقف تھی کہ عباس کی اولاد بنو امیہ کی جانی دشمن ہے۔ اور اس کا مہمان عبدالرحمٰن خاندان امیہ کا ایک فرد ہے۔ یہ دیکھ کر اس کا جی دہل گیا اور وہ سمجھ گئی کہ اب عبدالرحمٰن کی خیر نہیں ہے، اس لئے فوراً گھر گئی تاکہ اپنے باپ سے سارا ماجرا بیان کرے، لیکن اس وقت وہ بھی نہ ملا، اب سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ براہ راست عبدالرحمٰن کو اس خطرے سے آگاہ کرے۔ اس حد تک تو اس کے خیالات کی رفتار عام فطرت انسانی کے تحت عمل میں آئی، لیکن اس کے بعد ہی اس کے جذبات محبت جنبش میں آئے اور اس نے خیال کیا کہ عبدالرحمٰن کو خطرے سے آگاہ

کرنا گویا اپنے سے جدا کر دینا ہے اور اس کو وہ گوارا نہ کر سکتی تھی اس لئے اس کی محبت حیلہ جُو نے ـــ اور کونسی محبت جو حیلہ جو نہیں ہوتی ۔ یہ تدبیر نکالی کہ مردانہ لباس پہن کر اس کے پاس جائے، خطرے سے آگاہ کرے اور خود بھی اس کے ساتھ رہبر کی حیثیت سے ساتھ ہولے ۔ چونکہ عبدالرحمٰن نے اس وقت تک زبیدہ کی صورت نہ دیکھی تھی اس لئے یہ تدبیر اس کی بالکل ممکن العمل تھی ۔

زبیدہ نے اپنے باپ کا لباس پہنا اور دروازہ کھٹکھٹا کر عبدالرحمٰن سے سارا حال بیان کیا ۔ اول اول اس نے پس و پیش کیا ۔ لیکن جب زبیدہ نے مجبور کیا تو عبدالرحمٰن راضی ہو گیا اور آخرکار یہ تینوں غروب آفتاب سے قبل فرات میں کود سے تاکہ اس کو عبور کر کے نکل جائیں ۔ اس کوشش میں عبدالرحمٰن کا چھوٹا بھائی دریا کے اندر ڈوب گیا ۔ کہا جاتا ہے کہ عباسیوں کے ایک تیر نے اس کو زخمی کر دیا تھا ۔ جس سے وہ جان بر نہ ہو سکا اور دریا میں غرق ہو گیا ۔ بہرحال وہ عباسی لشکر کے تیر سے زخمی ہو کر مرا ہو یا کسی اور وجہ سے ، یہ واقعہ ہے کہ فرات کے دوسرے ساحل پر جس وقت عبدالرحمٰن پہنچا تو صرف رہبر اس کے ساتھ تھا اور اس کا چھوٹا بھائی اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکا تھا ۔

یہ دونوں چوروں کی طرح چھپتے ہوئے ۔ شام ، جبل لبنان ، فلسطین صحرائے سینا سے گذرتے ہوئے مصر کی حدود میں داخل ہوئے اور قیروان تک پہنچ گئے ۔ عباسیوں کی طرف سے مصر میں جو حاکم مقرر تھا اس کو بھی عبدالرحمٰن کی فراری کی خبر دیدی گئی تھی اور وہ بھی جستجو میں تھا ۔ لیکن عبدالرحمٰن مع زبیدہ اور ایک خادم کے جس کا نام بدر تھا اور جو مصر سے ساتھ ہو گیا تھا ۔ اندلس پہنچا ۔ اس وقت

یہاں کی حالت یہ تھی کہ نہ صرف بربر اور عربوں میں سیادت کی نزاع قائم تھی بلکہ خود عربوں کے اندر بھی مضری اور یمنی کی تفریق نے سارے ملک کے اندر انتشار پیدا کر رکھا تھا۔ اس بدامنی سے فائدہ اٹھا کر عبدالرحمٰن نے حکومت بنی امیہ کے لئے لوگوں کو دعوت دینی شروع کی اور آخر کار ستمبر ۷۵۶ء میں وہ بنوامیہ کا قائم مقام ہو کر یہاں کا حکمراں ہو گیا۔ اس نے قرطبہ میں نیا قلعہ تیار کرایا۔ مسجد بنوائی اور خطبہ سے منصور، خلیفۂ عباسی کا نام نکال کر اپنا نام داخل کیا۔ اسی عہد سے عبدالرحمٰن الداخل (اول) کے لقب سے مشہور ہوا اور تاریخ میں اپنی بے شمار یادگار چھوڑ گیا۔

حکومت و دولت کے زمانہ میں بھی عبدالرحمٰن نے اپنے شریک مصائب (زبیدہ) کو فراموش نہیں کیا اور اس کو کوئی جلیل القدر خدمت تفویض کرنی چاہی۔ کیونکہ وہ اب تک اسے مرد ہی سمجھتا تھا۔ لیکن جب ایک دن وہ اپنا مردانہ لباس اتار کر عبدالرحمٰن کے سامنے آئی تو اسے سخت حیرت ہوئی۔ لیکن اب بھی وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نے اسقدر تکلیفیں کیوں برداشت کی تھیں اور اس کے دل میں کس قسم کی آگ مشتعل تھی — عبدالرحمٰن الداخل جو سلطنت و سیادت کے دقیق ترین رازوں سے آگاہ تھا۔ جو حکومت و سیادت کے نازک ترین نکات کے سمجھنے میں اس قدر ذہین و ذکی تھا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی زبیدہ کی حالت کا اندازہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اور اس کے چہرے میں جو کھلا ہوا صحیفۂ محبت و عشق تھا۔ اس کے ایک جذبہ کا بھی مطالعہ نہ کر سکا۔ عبدالرحمٰن کی ساری زندگی میں غالباً یہی ایک واقعہ ایسا ہے جس سے اس کی بے حسی اور بلادتِ ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ عبدالرحمٰن نے زبیدہ کی انتہائی عزت کی

تمام امراء کے سامنے اسے "فارس جمیل" کا لقب عنایت کیا۔ لیکن زبیدہ کا اپنے وطن و اعزہ کو ترک کرنا۔ تمام مصائب برداشت کرنا اس غرض سے نہ تھا کہ وہ جاہ و شہرت کی طالب تھی بلکہ اس نے یہ تمام آلام اس بنا پر جھیلے تھے کہ وہ ایک دن اپنے محبوب سے مل جائے گی۔ اس لئے جب اس نے عبدالرحمٰن کے قلب کو اس درجہ بے حس پایا تو اس کا مایوس ہو کر حزیں و ملول ہو جانا بالکل فطری امر تھا۔ لیکن عبدالرحمٰن جو انتظام مملکت کے اہم مشاغل میں مصروف رہتا تھا اس کو کیا اس امر کا موقع مل سکتا تھا کہ زبیدہ کے نازک حسیات کو سمجھتا۔

ایک زمانہ اسی طرح گذر گیا یہاں تک کہ چند دنوں کے لئے اطمینان سے بیٹھنے کی فرصت اسے نصیب ہوئی۔

وہ ایک دن محل کے معاملات پر غور کر رہا تھا کہ دفعتاً اسے زبیدہ کا خیال پیدا ہوا اور اس نے ارادہ کیا کہ کسی سردار سے اس کا عقد کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے سر عسکری عبدالملک کو طلب کیا اور اس کی رضامندی حاصل کر کے زبیدہ سے دریافت کیا کہ اسے تو کوئی عذر نہیں ہے۔ زبیدہ اس کے قدموں پر گر پڑی اور باچشم پرنم بولی کہ "آپ مالک و مختار ہیں، میں کیا اور میری رائے کیا"

چنانچہ جشن زفاف کا اہتمام ہوا اور سارا قرطبہ اس خوشی میں چراغاں کیا گیا، لیکن جس وقت زبیدہ کے حجرے میں پہنچے تو وہ وہاں موجود نہ تھی، بلکہ عبدالرحمٰن کے حجرے میں پڑی رو رہی تھی۔ عبدالرحمٰن کو اطلاع ہوئی تو وہ خود وہاں گیا، لیکن یہ وہ وقت تھا جب زبیدہ سکرات موت میں مبتلا تھی۔

جب زبیدہ نے نگاہ واپسیں سے عبدالرحمٰن کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے

بھی حجاب اُٹھا اور اب سمجھ میں آیا کہ زبیدہ کا تمام آلام ومصائب اختیار کرنا کس لئے تھا لیکن یہ سمجھنا اب بعد از وقت تھا کیونکہ موت کی زردی اس کی پیشانی پر دوڑ چکی تھی۔

زبیدہ نے اپنی آخری نگاہ اُٹھائی اور کچھ گفتگو بھی کی، جس سے عبدالرحمٰن صرف اس قدر سمجھ سکا کہ اس نے زہر کھا لیا ہے۔

اس نے زبیدہ کو اپنے ہاتھوں پر سنبھالا اور سینہ سے لگا کر، آخر کار اسکو اس جگہ دم توڑنے کی اجازت دینی ہی پڑی جہاں تک پہنچنے کی تمنا میں وہ اتنے عرصہ سے گھل رہی تھی۔ عبدالرحمٰن نے جو مملکت کا انتظام تو کر سکتا تھا۔ لیکن ایک قلبِ مجروح کا مداوا اس کے اختیار میں نہ تھا، زبیدہ کی سرد پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور روتا ہوا حجرے سے باہر نکل آیا۔

تاتاری جذبۂ انتقام

تاتار کا فاتح اعظم، چنگیز خاں، اپنی آگ اور خون برسانے والی فوج لئے ہوئے شہر بخارا تک پہنچتا ہے اور چاروں طرف محاصرہ کر کے فرماں روائے بخارا کے پاس اپنا قاصد روانہ کرتا ہے۔

قاصد پہنچکر کہتا ہے :۔ میرا آقا چنگیز خاں، جو انسانی سروں پر خدا کی کھنچی ہوئی قہرمانی تلوار ہے۔ تم لوگوں تک پیغام پہنچاتا ہے کہ چونکہ تم نے دنیا میں فساد پھیلایا اور گمراہی اختیار کی اس لئے خدا نے مجھے بھیجا ہے کہ اس سرزمین کو فسق و فجور سے پاک کر دوں اور شر کا مقابلہ شر سے کروں، بنابراں شہر کی کنجیاں میرے پاس بھیجدو۔ اور آگر میری اطاعت کا حلف اٹھاؤ۔" چونکہ اس وقت بخارا میں مسلمانوں کی بیس ہزار فوج موجود تھی۔ اس لئے اس پیغام کا جواب اعلان جنگ کی صورت میں دیا گیا۔ اور آخر کار وہ جنگ شروع ہوگئی جسے سرزمین بخارا نے نہ اس وقت تک دیکھا تھا نہ آئندہ کبھی دیکھ سکی۔ اللہ اکبر کی صداؤں سے فضا گونج رہی تھی دشمن کے نعروں سے زمین دہل رہی تھی، خاک سے آسمان گرد آلود تھا اور خون سے زمین رنگین، مسلمانوں نے جس عزم ثبات سے مقابلہ کیا، تاریخ اسلام میں ہمیشہ یادگار رہے گا ——— لیکن ان کی چند ہزار کی جماعت۔ چنگیز کی ٹڈی دل

فوج کا کب تک مقابلہ کر سکتی تھی۔ آخر کار نتیجہ وہی ہوا جو کثرت کے مقابلہ میں قلت کا ہوا کرتا ہے اور چنگیز خاں نے شہر میں داخل ہوتے ہی حکم دیا کہ بچوں، بوڑھوں عورتوں کا قتل عام کر دیا جائے۔ اور جوانوں کو پابزنجیر کر کے حاضر کیا جائے۔

چنگیز کا معمول تھا کہ جب وہ کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوتا تو جوانوں کو قتل نہیں کرتا تھا بلکہ انھیں اپنی فوج میں شامل کر لیتا تھا۔ چنانچہ بخارا میں بھی اسی اصول پر عمل کیا گیا۔ اور جب قتل عام کے بعد شہر میں آگ لگا کر اسے بالکل خاکستر کر دیا تو پانچ ہزار جوانان بخارا کی جماعت پابزنجیر سامنے لائی گئی۔ یہ واقعہ ۶۱۷ھ یا ۱۲۲۰ء کا ہے۔

جس وقت بخارا کی تباہی و مسماری کے بعد چنگیز خاں کوچ کے لئے آمادہ ہوا تو سردار فوج حاضر ہوا اور عرض کی کہ " اے میرے آقا، مجھے حکم ہوا تھا کہ تمام عورتیں ذبح کر دی جائیں اور میں نے اس پر عمل کیا لیکن ایک عورت کو میں نے قتل نہیں کیا"۔ چنگیز نے پیشانی پر شکنیں ڈال کر کرخت آواز سے پوچھا کہ " وہ کون عورت ہے؟ اور اس نے کیا کیا؟" سردار نے جواب دیا کہ " یہ عورت مع اپنے شوہر کے ایک مکان میں پناہ گزین تھی اور اس نے ایک شیرنی کی طرح ہمارا مقابلہ کیا یہاں تک کہ اپنی فوج کے تیس آدمی ضائع کرنے کے بعد بمشکل اس پر قابو حاصل کر سکا۔ میں نے اس کے ضعیف شوہر کو تو اسی کے سامنے وہیں قتل کر دیا، لیکن اس کو حضور میں لایا ہوں کیونکہ صرف ذبح کر دینا اس کے لئے کافی سزا نہ ہو سکتی تھی"

چنگیز نے حکم دیا کہ " اس عورت کو سامنے لایا جائے"۔ اور جس وقت وہ حاضر کی گئی اور چنگیز کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ متحیر ہو کر چیخ اٹھا " اے ماتون —

تجھ پر خدا کا قہر نازل ہو، تو یہاں کیسے آگئی — "

(۲)

واقعات سمجھنے کے لئے تقریباً ایک ربع صدی قبل کے صفحات اُلٹ دیجئے۔ چنگیز کا عہد طفلی ہے اور اس کا باپ شمالی چین میں ایک تاتاری قبیلہ پر حکمراں ہے۔ دفعتاً اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اہل قبیلہ بگڑ بیٹھتے ہیں اور چنگیز کے ہلاک کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چنگیز کی ماں دانشمندی سے کام لے کر اپنے کمسن بچے کو لے کر اپنے شوہر کے ایک قدیم دوست کے پاس چلی جاتی ہے۔ جو خود بھی ایک قبیلہ کا سردار ہے۔

یہ امیر، چنگیز اور اس کی ماں کو پناہ دیتا ہے اور چنگیز میں آثار شجاعت دیکھ کر اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دیتا ہے۔ چنگیز روز بروز اپنی جرأت و بسالت سے امیر کے دل میں گھر کرتا جاتا ہے امیر کا بیٹا اس کا یہ عروج دیکھ کر اس سے جلنے لگتا ہے اور اپنے باپ کو اس کی بہت سی جھوٹی شکایتیں کر کرکے چنگیز کا دشمن بنا دیتا ہے۔ چنگیز کی بیوی کو جب یہ خبر معلوم ہوتی ہے تو وہ تمام حالات سے اپنے شوہر کو آگاہ کرتی ہے اور وہ دونوں وہاں سے چل کھڑے ہوتے ہیں، لیکن اسی دوران میں یہ خبر مشہور ہوتی ہے کہ امیر معہ اپنے بیٹے کے قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۶۰۳ھ یا ۱۲۰۶ء کا ہے اہل قبیلہ چنگیز کے پاس جاتے ہیں اور اس کو لا کر اپنا امیر مقرر کرتے ہیں۔

ٹھیک اسی وقت جبکہ افراد قبیلہ، افسردہ انگوری پی کر مشتعل آگ کے چاروں طرف رقص و سرود میں مصروف ہوتے ہیں۔ دفعتاً ایک عورت صفوں کو

چیر کر نمودار ہوتی ہے اس حال میں کہ اس کے کپڑے تار تار ہیں۔ سر کے بال پریشان ہیں اور وہ آگ کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا کر چیختی ہے کہ "اے بزدلو! اے کمینو! تمھارے امیر اور اس کے لڑکے کا قاتل وہی ہے جس کو تم نے اپنا سردار بنایا ہے، تم نے اپنے عہد وفاداری کو توڑ دیا۔ تم نے خیانت کی۔ لیکن میں اپنے اس عہد پر قائم ہوں اور میں اس بھڑکنے والی آگ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ اے چنگیز، میں تجھ سے اس کا انتقام ضرور لوں گی اور جب تک اپنے عہد کو پورا نہ کروں گی، میرا سینہ اس دہکتی ہوئی آگ کی طرح جلتا رہے گا" یہ کہہ کر وہ عورت کسی طرف نکل گئی۔ چنگیز نے پوچھا "یہ کون تھی؟" لوگوں نے جواب دیا کہ "اس کا نام ہامون ہے اور یہ مقتول امیرزادے کی محبوبہ تھی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔"

(۳)

یہ وہ عورت تھی جسے چنگیز خاں کی فوج کا سردار تباہی بخارا کے بعد سامنے لایا اور جس کو دیکھتے ہی تمام پچھلے واقعات اس کے سامنے آگئے۔ یہ عورت چنگیز خاں سے انتقام لینے کا عہد کرکے خدا جانے کہاں کہاں آوارہ پھرتی رہی، اور جب بخارا آئی تو ایک عرب عبداللہ الموصلی نے اس کو اپنے یہاں ٹھہرا لیا اور اس سے شادی کرلی۔ اس ازدواج سے تین لڑکے پیدا ہوئے اور اس نے ان تینوں لڑکوں میں شروع ہی سے تاتاری انتقام و نفرت کے جذبات چنگیز کے خلاف پیدا کرنے شروع کئے۔ وہ خوش تھی کہ جب یہ لڑکے جوان ہوں گے تو ان کی مدد سے وہ ایک جماعت پیدا کرے گی۔ اور چنگیز سے جنگ کرکے اپنے قدیم عہد انتقام کو پورا

کرے گی، لیکن اتفاق سے اسی زمانے میں خود چنگیز، بخارا تک آگیا اور ہامون نے اپنے شوہر کے دوش بدوش عساکر تاتاری کا ایسا سخت مقابلہ کیا کہ جب تک تیس آدمی اس نے فنا نہیں کر دئے قابو میں نہ آئی۔

(۴)

چنگیز خاں نے حکم دیا کہ ایک گڑھا کھودا جائے اور ہامون کو مع اس کے تینوں لڑکوں کے زندہ دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ جب تک اس کی تعمیل نہ ہوئی وہ وہیں موجود رہا اور جب ان کی آخری چیخ کو مٹی کے آخری وزن نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تو نہایت مسرور وہ اپنی گاڑی پر سوار ہوا جس میں تیس بیل جتے ہوئے تھے اور دوسرے ملکوں کی تباہی یا بقول اس کے "شر کا مقابلہ شر سے کرنے کے لئے" بے نیازانہ آگے بڑھا۔ اس حال میں کہ شہر بخارا کے کھنڈروں سے اب بھی کہیں کہیں دھواں بلند ہو رہا تھا اور ذبح ہونے والے معصوم بچوں اور عورتوں کی کراہ ہنوز فضا میں گونج رہی تھی۔

صلاح الدّین ایوّبی کے دو آنسو

۵۷۸ھ کا زمانہ ہے کہ ایک قافلہ صلاح الدین ایوّبی کے لئے اسباب حرب سامان رسد لئے ہوئے بیروت کے پاس سے گذرتا ہے اور یہاں کے فرنگی اسے لوٹ لیتے ہیں سلطان ایوّبی سخت برہم ہوتا ہے اور یہ عزم لے کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ دشمن سے اس گستاخی کا انتقام لے گا اور بیروت و ساحل لبنان پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرے گا۔

سلطان صلاح الدین ایوّبی، مصر و شام پر قابض ہو کر فرنگیوں سے ایک ایک کر کے بہت سے قلعے چھین چکا تھا اور اب اس کی نگاہ بیت المقدس پر تھی جہاں صلیبیوں کی قائم کی ہوئی حکومت پر بالڈوین چہارم اسوقت فرما نروائی کر رہا تھا

قافلہ کی غارت گری کے واقعہ سے اس کو ایک بہانہ ہاتھ آیا اور اس فرصت کو غنیمت جان کر اس نے اپنی فوجوں کو جمع کیا اور دفعتاً یلغار کر دیا اُس کے بھائی "العادل" نے مصر سے تین جہاز بطور کمک کے روانہ کئے اور یہ عسقلان کی تسخیر کرتا ہوا بیروت پہنچا اور محاصرہ شروع کر دیا۔ لیکن ادھر بیت المقدس سے بالڈوین چہارم، اہل بیروت کی مدد کے لئے آگیا اور صلاح الدین کو واپس آنا پڑا صلاح الدین کی یہ واپسی ایسی نہ تھی کہ ہمیشہ کے لئے جنگ کا خاتمہ ہو جاتا، بلکہ

اس واقعہ نے ... اس کے اندر عزم و استقامت کی روح کو زیادہ قوی اور اس کی تاخت کو زیادہ وسیع بنا دیا۔

جس وقت وہ قاہرہ سے روانہ ہوا تھا تو اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اُس وقت تک چین نہ لے گا جب تک شام کے ایک ایک قلعہ پر اسلام کے جھنڈے کو لہراتا ہوا نہ دیکھ لے۔ چنانچہ وہ سرزمین حلب سے لیکر صحرائے سینا تک اور دمشق سے لیکر بادیۂ شام تک ہر جگہ اپنی جرأت و پامردی کے سکے بٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ ۵۷۹ھ میں اس نے حلب پر قبضہ کر کے دریائے دردن کو عبور کیا اور بیسان پر قبضہ کر کے فرنگیوں کے اس قلعہ کی طرف بڑھا جو سب سے زیادہ مضبوط سمجھا جاتا تھا۔

یہ قلعہ شہر کرک کا تھا جو اپنی مضبوط شہر پناہ کے لحاظ سے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ مقام پہاڑیوں کے درمیان اس طرح واقع ہوا تھا کہ محاصرہ بہت دشوار تھا اور اس وقت تک یہاں کا قلعہ کسی سے سر نہ ہو سکا تھا۔

صلاح الدین نے اپنے بھائی "العادل" سے مصری عساکر کی کمک طلب کی اور پوری قوت کے ساتھ اس نے کرک تک پہنچکر چاروں طرف منجنیقیں نصب کر دیں۔ فرنگیوں نے بھی پوری احتیاط سے کام لیا تھا اور کثیر ذخیرۂ حرب و سامان رسد فراہم کر کے پوری عسکری قوت کے ساتھ مدافعت کا عزم کر لیا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ سلطان صلاح الدین قلعہ کو سر نہ کر سکے گا اور اس طرف صلاح الدین روزانہ حملے کرتا تھا اور محاصرہ میں شدت بڑھاتا جاتا تھا۔ خیر اس معرکۂ قتال کی داستان کو یہیں چھوڑیئے اور دیکھئے کہ قلعہ کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

(۲)

قلعہ کے مشرقی برج میں آج غیر معمولی چہل پہل نظر آتی ہے اور لوگوں کی آمد و رفت بکثرت جاری ہے۔ لیکن یہ ہنگامہ کسی تدبیر جنگ سے متعلق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ آنے جانے والوں کے لباس ایسے ہیں جو جشن مسرت کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ عورتیں، بچے، مرد، آجا رہے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں پھولوں کا ہار ہے۔ کوئی شمع لئے جا رہا ہے۔ کوئی رنگ برنگ کے فیتے اڑا رہا ہے۔ اسی جماعت میں چند رہبان بھی ہیں جن میں سے بعض تسبیح لئے ہوئے ہیں اور بعض عود دان۔ خدام کی جماعت طباقوں میں قسم قسم کے کھانے اور شرابیں ادھر سے ادھر لئے جا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی نہایت مہتم بالشان جشن طرب برپا ہونے والا ہے۔ ہر چند سب کے چہروں سے آثار مسرت ظاہر ہو رہے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی خوف و کدورت کی علامت بھی نظر آنے لگتی ہے کہ معلوم نہیں جنگ کا نتیجہ کیا ہو۔

آج یہاں تقریب نکاح ہونے والی ہے جس میں کونٹ ٹوردن، کونٹ رینو کی ربیبہ کے ساتھ رشتہ ازدواج سے وابستہ کیا جائے گا۔ دولہا اُن چند نوجوانوں میں سے تھا جن پر اہل فرنگ نہ صرف بہ لحاظ حسب و نسب بلکہ بہ حیثیت شجاعت و مردانگی بھی فخر کرتے تھے، اور دلہن، اس کونٹ رینو کی بیٹی (ربیبہ) تھی جو اپنے دارالامارۃ انطاکیہ میں رہتا تھا اور قلعۂ کرک اسی کی حکومت میں شامل تھا۔

بعض کی رائے یہ ہوئی کہ یہ تقریب کرک کے علاوہ کسی اور جگہ عمل میں آئے تاکہ دولہا دلہن میدان کارزار سے دور رہ کر لطف و مسرت کے دن بسر کر سکیں لیکن کونٹ ٹوردن اس پر راضی نہ ہوا اور اس نے کہا کہ تیغ و تفنگ کی آوازوں سے

زیادہ کوئی آواز اس کے لئے باعث مسرت نہیں اور اس لئے وہ اپنی شادی اس ہنگامۂ جنگ میں قلعہ کرک کے اندر ہی کرے گا۔

(۳)

غروب آفتاب سے قبل شہر پناہ کا ایک دروازہ کھلتا ہے خندق پر پل استوار کیا جاتا ہے اور چالیس آدمی اپنے سروں پر طباق لئے ہوئے قلعہ کے اندر سے نکل کر اہل عرب کے لشکر کی طرف بڑھتے ہیں۔ ان کے آگے آگے ایک سوار ہے جو ہاتھ میں سفید جھنڈا لئے ہوئے ہے۔

جس وقت یہ سوار لشکر اسلام میں پہنچتا ہے تو صلاح الدین اسے اپنے خیمہ کے اندر بلا کر آنے کی وجہ دریافت کرتا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ:-

اے آقا، مجھے کونٹ تورون کی ماں نے یہ خط لے کر بھیجا ہے اور اپنے بیٹے کی تقریب شادی میں کچھ تحائف روانہ کئے ہیں امید ہے کہ قبول کئے جائیں گے۔

صلاح الدین نے مسکراتے ہوئے وہ خط لے لیا جس میں تحریر تھا۔

"اے سلطان عرب! آج ہمارے چھوٹے سے شہر میں جشن طرب برپا ہے اور میرے بیٹے کونٹ تورون کی شادی ہو رہی ہے۔ اس لئے میں نے پسند نہ کیا کہ تم کو اس مسرت میں شریک نہ کروں۔

اے صلاح الدین، غالباً وہ زمانہ تم کو یاد ہوگا جب تم ہمارے محلوں میں ایک قیدی کی حیثیت سے رہتے تھے اور اپنی آغوش میں ایک چھوٹی سی لڑکی (ایشانٹ) کو لے کر ادھر ادھر باغوں میں پھرا کرتے تھے۔ وہی ایشانٹ

بڑھ کر جوان ہوئی۔ شادی ہوئی اور ایک لڑکا اس سے پیدا ہوا جو آج اپنی قوم کا سردار ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم اسے دیکھو تو تم اس سے بھی ویسی ہی محبت کرو جیسی کہ اس کی ماں سے اس کے بچپن میں کرتے تھے وہ اینٹانٹ میں ہی ہوں اور کونٹ ٹورون میرا ہی بیٹا ہے۔

اس لئے اس تقریب کی خوشی میں کچھ کھانا اور شراب بھیجتی ہوں تاکہ تمہاری فوج بھی اس مسرت میں ہماری شریک ہو، اور اے سلطان عرب مجھے امید ہے کہ تم اس چھوٹی سی لڑکی کی یاد اپنے دل سے کبھی محو نہ کرو گے جس پر تم نے کبھی اپنی انتہائی محبت و شفقت صرف کی تھی اور اسکی طرف سے یہ حقیر ہدیہ قبول کرو گے۔"

جس وقت صلاح الدین یہ خط پڑھ چکا تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے اور اس نے سوار سے کہا "اپنی ملکہ سے جا کر کہہ دو کہ صلاح الدین کبھی ان ایام کو نہیں بھول سکتا جب وہ اہل فرنگ کے قصور و محلات میں پیاری اینٹانٹ کو اپنی آغوش میں لے کر پھرا کرتا تھا۔ آج تک اس کے دل میں اینٹانیٹ کی معصوم تبسم کے نقوش اسی طرح تازہ ہیں اور معلوم نہیں کتنی بار وہ ان ایام کی یاد سے بے قرار ہو گیا ہے۔ میری طرف سے میری دلی دعائیں اس تقریب کے مسعود و مبارک ثابت ہونے کی پہنچا دو اور کہہ دو کہ میں نہایت فخر و مسرت کے ساتھ یہ ہدیات محبت قبول کرتا ہوں اور اپنی فوج کو حکم دیتا ہوں کہ وہ بھی پوری مسرت کے ساتھ اس جشن میں شریک ہو اور اس برج کے پاس بھی نہ جائے جس میں یہ تقریب مسرت آج ادا کی جا رہی ہے۔ میری طرف سے اپنی ملکہ کو سلام پہنچا کر کہو کہ وہ اینٹانیٹ

کا آج بھی ویسا ہی سچا دوست ہے جیسا کل تھا۔"

سوار یہ پیغام لے کر واپس گیا اور ادھر صلاح الدین نے حکم دیا کہ ایک رات کے لئے جنگ ملتوی کر دی جائے۔ چنانچہ وہ رات قلعۂ کرک کی عجیب و غریب رات تھی کہ اندر اہلِ قلعہ مسرور نشاط تھے اور باہر دشمن کی فوج -

کالیگولا کی خوں آشامیاں

کالیگولا ۳۷ء میں تخت روما پر بیٹھا اور ۴۱ء میں ایک منتقم المزاج سردار کیریاس نے اسے قتل کر کے ایک ایسے خدائی قہر و عذاب کو دفع کیا، جس کی مثال تاریخ عالم میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ کالیگولا نے صرف پانچ سال حکومت کی۔ لیکن اس مختصر مدت میں خوں ریزی و خوں آشامی، سفاکی و درندگی کے ایسے ایسے نقوش اپنے بعد چھوڑ گیا کہ دنیا کی کوئی سلطنت ان کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

کالی گولا، صورت شکل کے لحاظ سے جیسا حسین اور دلکش انسان تھا، ویسا ہی دل کے لحاظ سے وہ مکروہ و قابل نفرت تھا۔ اسے اس وقت تک نیند نہ آتی جب تک دن میں کم از کم ایک بار اپنے ہاتھ کو بے گناہ انسانوں کے خون سے رنگین نہ کر لیتا۔

(۲)

ایک دن حسب معمول خون سے اپنی پیاس بجھانے کے لئے منتظر و آمادہ بیٹھا ہوا ہے کہ دفعتاً اسے کچھ خیال آجاتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ ان چالیس امراء اور غلاموں کو اس کے سامنے ذبح کیا جائے، جنھوں نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ یہ سن کر

ایک مقرب سردار نے کہا کہ "کیا مناسب نہیں کہ ان کی خطائیں معاف کر کے اہل روما کا دل ہاتھ میں لے لیا جائے۔" کالیگولا نے غضب ناک ہو کر کہا: "میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تمام اہل روما کا ایک سر ہوتا اور میں ایک ضرب میں اسے ہمیشہ کے لئے قطع کر کے رکھ دیتا۔"

جس وقت کالی گولا اپنی اس خون آشام تفریح میں مشغول ہوتا، تو باشندگان روما کو یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ اس کا ذکر کریں بلکہ صرف یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ:-

"بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے۔"

(۳)

ایک روز کالی گولا، قونصل افرانیوس، پر برہم ہوا اور محل کی کھڑکی سے اسکو سڑک پر اٹھا کر پھینک دیا۔ اس کی ہڈیاں چور چور ہو گئیں اور وہ مر گیا۔ لوگوں نے پوچھا "اے قیصر! اب کس کو اسکی جگہ قونصل مقرر کیا جائے۔" تو اس نے جواب دیا کہ "میں اپنے گھوڑے انساتوس کو اس کی جگہ قونصل مقرر کرتا ہوں۔"

اس قسم کے واقعات کے بعد بادشاہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی سڑکوں پر تفریح کے لئے نکلتا اور اہل روما کے سروں کو گھوڑے کی ٹاپ سے روندتا ہوا کچلتا ہوا گذر جاتا۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنستا اور لوگ یہ کہتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے کہ "بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے۔"

(۴)

ایک رات اس نے اپنی محبوبہ سے نشۂ شراب و محبت کے عالم میں کہا۔ "آج میں نے چار سرداران روما کو گرفتار کیا ہے۔ جن کے متعلق مجھ سے کہا گیا تھا کہ

وہ میرے خلاف سازش کر رہے تھے۔ میں نے ایک کوڑا مجرئے کا تیار کرایا ہے اور چاہتا ہوں کہ تو اپنے ہاتھ سے تیس تیس کوڑے سب کے سامنے ان کو مارے۔"
اس نے کہا، "اے شہنشاہ اس خیال سے باز آ مجھے اس کام پر مجبور نہ کر کیونکہ اس سے اہل روما کو اور زیادہ نفرت بڑھ جائے گی۔"

بادشاہ یہ سن کر ہنسا اور بولا "مجھے ان کی نفرت یا محبت کی کوئی پرواہ نہیں میرے لئے اس سے زیادہ مسرت اور کسی امر میں نہیں کہ اہل روما کو میں اپنے سامنے خوف سے کانپتا ہوا دیکھوں۔"

آخرکار اس کی مجبوری نے تیس تیس کوڑے امرا روما کی پشت پر مارے، اور لوگ یہ دیکھ کر وہاں سے یہ کہتے ہوئے واپس آئے کہ بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے۔"

(۵)

ایک دن اس کی دایہ جونیا آئی جس نے کالی گولا کو اپنی گود میں کھلایا تھا دودھ پلایا تھا۔ اس نے کہا، "اے میرے بیٹے قیصر، میں چاہتی ہوں کہ تو میری بیٹی اسٹیلا کو مخصوص نظر عنایت سے دیکھے اور اس کے لئے سرداران روما میں سے کوئی شوہر تلاش کر دے، کیونکہ اب وہ جوان ہو گئی ہے۔ جس وقت بادشاہ نے اپنی رضاعی بہن اسٹیلا کے حسن و شباب کو دیکھا تو بدحواس ہو گیا اور اس کی طرف دست ہوس دراز کیا۔ اس لڑکی نے انکار کیا۔ اس کی ماں نے کہا یہ تو کیا کر رہا ہے تجھ پر کہیں آسمان نہ پھٹ پڑے۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا اور لڑکی اور اس کی ماں دونوں نے زہر کھا کر اپنی جانیں دیدیں۔ اس واقعہ کے بعد جب

دایہ کا لڑکا بادشاہ کے پاس آیا کہ محاسبہ کرے تو بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے اسے ذبح کر کے لاش کو سڑک پر پھنکوا دیا جسے اہل روما نے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے گذر گئے کہ " بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے "

(۶)

ایک دن قیصر اپنے تمام حاشیہ نشین سرداروں کو لے کر سیر و شکار کے لئے نکلا اور بحیرۂ نیمی تک پہنچ گیا۔ جسے اہل روما " آیئنۂ ڈیانا " کہتے تھے یعنی اُسے جیوپیٹر کی بڑی بیٹی ڈیانا (سیر و شکار کی دیوی) سے منسوب کرتے تھے جس کا ہیکل اسی جگہ ساحل پر قائم تھا۔

قیصر، معبد ڈیانا پر پہنچا۔ اپنے گھوڑے سے اُتر کر اندر گیا اور پجاری سے شراب طلب کی۔ اسی اثنا میں اس کی نگاہ ہیکل کے سب سے بڑے پجاری پر پڑ گئی جو نہایت ضعیف تھا اور عصا کے سہارے سے ایک ایک قدم اٹھاتا تھا۔ قیصر نے پوچھا، تیری عمر کیا ہے۔ اس نے کہا کہ " سو سال سے متجاوز ہے اور ساٹھ سال سے ڈیانا کی خدمت کر رہا ہوں " بادشاہ یہ سنکر ہنسا اور بولا کہ " اس کی گردن جدا کر دو کیونکہ روما کے لئے یہ امر باعث عار و ننگ ہے کہ ڈیانا کی خدمت ایسے ناکارہ و ضعیف انسان کے سپرد کی جائے۔"

چنانچہ اس کی گردن کاٹ ڈالی گئی اور امرأ باہم دگر سرگوشیاں کرنے لگے کہ " بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے۔"

(۷)

بادشاہ کو یہ مقام بہت پسند آیا اور اپنے خادم لوسیوس سے کہا کہ یہیں چند دن

یہاں قیام کرنا چاہتا ہوں۔ لوسیوس نے بادشاہ کے اس ارادہ کا ذکر سرداروں سے کیا اور انھوں نے فوراً دو نہایت خوبصورت کشتیاں بحر ناپولی سے بحیرۂ نیمی میں طلب کرلیں اور بادشاہ نے حکم دیا کہ ان کشتیوں کی آراستگی میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا جائے۔ چنانچہ تمام شاہانہ اسباب ان میں منتقل کیا گیا۔ بجائے رسیوں کے سونے چاندی کی زنجیریں بنا کر ڈال دی گئیں، سنگین فانوس جابجا معلق کئے گئے۔ اور چراغوں میں بجائے تیل کے عطر ڈالا گیا۔ کشتیوں کے حجرے عورتوں کے قیام کے لئے مخصوص کئے گئے اور بادشاہ لطف و مسرت سے رہنے لگا

ایک دن بیٹھے بیٹھے بادشاہ نے کہا: "میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ انسان پانی میں کس طرح ڈوبتا ہے" اور دریافت کیا کہ کتنے غلام کشتیوں میں موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ تیس غلام موجود ہیں۔ حکم ہوا کہ ان کو پانی میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ وہ پانی میں پھینک دئے گئے۔ اور اگر کوئی غلام اپنی جان بچانے کے لئے کشتی کا رُخ کرتا تھا تو چپوؤں سے اس کو مار مار کر پھر بھگا دیتے تھے اور ہنستے تھے۔ ساحل پر جو لوگ جمع تھے وہ یہ منظر دیکھ رہے تھے، اور آپس میں کہتے جاتے تھے کہ "بادشاہ اس وقت سیر و تفریح میں مشغول ہے"

(۸)

قیصر کو ایک صبح اطلاع دی گئی کہ روما میں کچھ لوگوں نے بادشاہ کے خلاف سازش کی ہے۔ اس نے دو سرداروں کو متعین کیا کہ فوراً جاکر سازش کرنے والوں کو گرفتار کیا جائے اور اس طرف حکم دیا کہ آج کی رات رقص و سرود میں بسر کی جائے چنانچہ کشتیوں کی تمام کنیزیں جمع کی گئیں اور انھوں نے اپنی اپنی زبانوں اور اپنے

اپنے لحن میں مختلف گیت گانے شروع کیے، انھیں نغموں میں ایک نہایت ہی حزیں و طویل نغمہ بادشاہ کے کانوں تک پہنچا جو ایک نوعمر کنیز کے لبوں سے نکل رہا تھا بادشاہ نے اس کو قریب بلایا اور وہ کانپتی ہوئی پاس آگئی۔

بادشاہ نے کہا۔ "ڈرو نہیں، مجھے بتا تیرا نام کیا ہے۔"

کنیز:- میرا نام سیفا ہے۔

بادشاہ:- تو کس ملک کی ہے۔

کنیز:- مصر کی ہوں۔

بادشاہ:- تیرا باپ کون تھا؟

کنیز:- میرے باپ کا نام پروکلس تھا اور وہ ایک لشکر میں سپاہی تھا۔ اس نے ایک مصری عورت سے شادی کی تھی جب ہمارے ماں باپ مر گئے تو مجھے گرفتار کر کے بطور ہدیہ کے لیے یہاں لے آئے۔

بادشاہ:- تجھے روما میں کون لایا۔

کنیز:- محافظ دستہ شاہی کا ایک افسر لیبدوس مجھے لایا تھا۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ لیبدوس کو بلایا جائے۔ جب وہ سامنے آیا تو اسے خنجروں سے ہلاک کر کے پانی میں ڈال دیا گیا اور دیکھنے والوں نے مسکراتے ہوئے آپس میں کہا کہ "آج بادشاہ سیر و تفریح میں مشغول ہے۔"

(۹)

بادشاہ نے اس مصری کنیز سے کہا کہ "چھیڑ دے گا جو ابھی تو گا رہی تھی" اور دوسری کنیزوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ کنیز کی دلدوز آواز بلند ہوئی۔ اس نے

گانا شروع کیا :۔

دنیا میں بہت سے سمندر ہیں
لیکن تو سب سے زیادہ خوبصورت ہے
دنیا میں بہت سے دریا ہیں
لیکن تو سب سے زیادہ حسین ہے
میری ماں تیرے کنارے گایا کرتی تھی
میرا بھائی تیرے کنارے کاشت کیا کرتا تھا
اے سب سمندروں سے زیادہ حسین سمندر
اور اے سب دریاؤں سے زیادہ دلکش دریا

یہ گا کر کنیز خاموش ہوگئی اور قیصر کی آنکھ سے آنسو ڈھلک پڑا ۔

بادشاہ نے پوچھا " اے لڑکی تو نے کس سمندر کا ذکر کیا "

کنیز :۔ بحر اسکندریہ

بادشاہ :۔ اور دریا کونسا ہے :

کنیز :۔ دریائے نیل !

بادشاہ :۔ یہ گیت تجھے کس نے سکھایا ؟

کنیز :۔ میری ماں نے !

بادشاہ :۔ مجھے بھی یہ گیت یاد ہے ۔ میری دایہ جونیا بھی تیری ماں کی طرح مجھے گود میں لیکر یہی گیت گایا کرتی تھی ۔ لیکن میں نے جونیا کو ہلاک کر ڈالا "

یہ کہہ کر بادشاہ پر دفعتاً سکوت طاری ہوا اور چہرہ پر اضمحلال پھیل رات

کے سکوت میں بادل کی گرج کی طرح وہ چیخ اُٹھا کہ "آئینۂ دنیا تااب مکدر ہوگیا ہے اس لئے اس جگہ کو فوراً چھوڑ دیا جائے۔ لیکن جانے سے قبل یہاں کوئی یادگار چھوڑنا ضروری ہے" چنانچہ اس نے حکم دیا کہ سب لوگ کشتیوں سے اتر کر خشکی پر آجائیں اور کشتیوں میں سوراخ کردیا جائے تاکہ وہ تمام سامان کے ساتھ وہیں غرق ہوجائیں۔

یہ حکم دے کر بادشاہ نے کنیز سے مخاطب ہوکر کہا۔ "میں تجھے قصرِ شاہی میں سب سے زیادہ معزز مرتبہ پر پہنچاؤں گا اور تجھے اپنے باغ کا بہترین پھول بناکر رکھوں گا۔"

یہ سن کر کنیز زار زار رونے لگی، کیونکہ حقیقتاً وہ اس وعدہ انعام سے خوش نہ تھی اور وطن سے دور رہ کر اس کی زندگی نہایت تلخ گزر رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت کہ لوگ کشتیوں سے بھاگ بھاگ کر قیصر کے پیچھے پیچھے ساحل کی طرف جارہے تھے۔ وہ دونوں سردار واپس آئے جو سازش کرنے والوں کو گرفتار کرنے گئے تھے اور عرض کی کہ قیصر کے دشمن گرفتار کرلئے گئے۔

2 بادشاہ نے پوچھا وہ کتنے تھے۔ جواب ملا کہ "نو مرد ایک عورت" بادشاہ نے دریافت کیا کہ ان باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ سرداروں نے کہا کہ "ان کو ذبح کردیا گیا۔"

بادشاہ نے کہا، "تم نے خوب کیا، لیکن اہلِ روما نے یہ دیکھ کر کیا کہا۔۔؟"

سردار نے کہا: "انھوں نے کہا کہ خدا قیصر کی عمر میں برکت دے۔"

(۱۰)

قیصر، ساحل پر ایک بلند جگہ بیٹھا ہوا ہے۔ اور کشتیوں کے ڈوبنے کا منظر سامنے ہے۔ دفعتاً ایک کشتی کی طرف سے آواز آئی کہ "اے حسین ترین سمندر، اے جمیل ترین دریا"

بادشاہ چونک پڑا اور اس نے مصری کنیز کو آواز پہچان کر پوچھا "وہ کہاں ہے" سب لوگ یہ سن کر خاموش رہے کیونکہ وہ کشتی سے باہر نہ آئی تھی اور ڈوب جانے ہی کے لئے وہاں رہ گئی تھی ——

آہستہ آہستہ کشتیاں ڈوب گئیں اور انھیں کے ساتھ مصری کنیز کا وہ گیت بھی ہمیشہ کے لئے فنا ہوگیا۔ جو بادشاہ کے کان میں اب بھی گونج رہا تھا۔

بادشاہ کی آنکھ سے دوسرا آنسو ٹپکا اور لوگ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ "آج بادشاہ سیر و تفریح میں مشغول ہے۔"

ایک شاعر کی الہامی پیشین گوئی

ستمبر ۱۹۳۱ء کی اٹھارہ تاریخ ہے۔ طرابلس کے ایک قصبہ میں اطالوی افسران فوج کی ایک جماعت مصروف مشورہ ہے کہ عمر المختار کو جس نے طرابلس میں لواء حریت واستقلال بلند کیا تھا اور جو بعد کو گرفتار ہو کر ان کے ہاتھ آگیا تھا، کیا سزا دی جائے۔

آخر کار سزا تجویز ہو گئی، حکم سنا دیا گیا۔ اور یہ طرابلسی نوجوان مجمع عام میں بندوق کا نشانہ بن کر اپنے وطن پر قربان ہو گیا۔ یہ واقعہ بظاہر تاریخ کا بہت معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اندرون طرابلس غربی میں اسی واقعہ کے بعد اطالوی اقتدار پوری طرح قائم ہو سکا

(۲)

اچھا اب آپ ولادت مسیح سے چھ صدی قبل کے زمانے میں چلے جائیے۔ جب یونان کا سب سے بڑا شاعر و کاہن ارسطو زندہ تھا (یہ ارسطو اس ارسطو سے مختلف ہے جو حکیم و فیلسوف کے لقب سے مشہور رہا)

ملک کے چند نوجوانوں نے مشورہ کیا کہ "ہیکل ڈلفی" میں جاکر دیوی کی پوجا کریں اور وہاں کاہنوں کے سردار سے التجا کریں کہ وہ مستقبل کے حالات بتائے۔

چنانچہ وہ پَیل کے سب سے بڑے کاہن کے پاس گئے، جس کا نام ارسطو تھا اور جس کی شہرت ایک شاعر و کاہن کی حیثیت سے اس وقت تمام اکناف یونان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے لوگوں کی التجا سن کر معبد دلفی کا رُخ کیا، اور مراسم عبادت کرنے لگے۔ بعد یہ وحی اس پر نازل ہوئی کہ:-

"اے ارسطو، اپنے احباب و اعزا، اپنے ارادت مند اور بہی خواہ لوگوں کو ہمراہ لے کر اور بحری سفر اختیار کر کے جنوب کی طرف جا اور وہاں جدید یونانی حکومت کی بنیاد ڈال۔"

چنانچہ ارسطو معہ اپنے رفقاء کے ایک بڑی کشتی میں سوار ہوا۔ اور اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر راتوں کی تاریکی میں سمندر کے طوفان سے گذرتا ہوا جنوب کی طرف نکل گیا۔ ایک زمانہ تک اسی بیم و رجا کی حالت میں سفر کرنے کے بعد کشتی شمالی افریقہ کے کسی ساحل پر حدود مصر کے قریب پہنچ گئی۔ اور یونانی نوجوانوں کی یہ جماعت یہیں اتر پڑی۔ انھوں نے یہاں ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی۔ جس کا نام سیرینا رکھا۔ اور اس طرح گویا ایک جدید سلطنت یونانی کا تخم انھوں نے بو دیا یہ واقعہ ۶۳۰ سال قبل مسیح کا ہے۔

(۳)

اس جماعت نے ارسطو کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اور باتوس اس کا نام رکھا۔ ان لوگوں نے ارسطو سے یہ بھی درخواست کی کہ اب وہ شعر و شاعری ترک کر کے ان کے لئے قوانین وضع کرے۔

لیکن یہ بادشاہ شاعر اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہا۔ اور

جب اس کے مرنے کا وقت قریب آیا تو اس نے لوگوں کو جمع کر کے کہا۔ کہ :-

"اے عزیزو! میں نے ایک خواب دیکھا ہے، اسے سن و! میں نے دیکھا کہ دیوتا ابولون دفعتاً مجھ پر ظاہر ہوا۔ اور میرے ہاتھ میں ایک سبز شاخ دے کر بولا کہ اے ارسطو اب تو جلد مرنے والا ہے اور جس سلطنت کی بنیاد تو نے ڈالی ہے۔ وہ یونانیوں کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس لئے سب کو جمع کر کے اطلاع دیدو کہ حکومت سیرینا ان کے ہاتھ سے نکل کر اہل روما کے پاس جائے گی۔ پھر اس پر ایک شرقی غربی حکومت قابض ہوگی۔ اس کے بعد دوسری شرقی حکومت کے اقتدار میں چلی جائے گی۔ پھر تیسری شرقی حکومت کا تصرف قائم ہوگا اس کے بعد پھر چوتھی شرقی حکومت کا زمانہ آئے گا۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی جو خواب میں مجھ کو بتائی گئی ہے۔ بلاکم وکاست تم کو سنائے دیتا ہوں۔"

ارسطو یہ خواب بیان کر کے مرگیا۔

(۴)

ارسطو کے بعد زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا کہ اہل روما کی فتوحات تمام عالم پر ایک سیلاب کی طرح بڑھنے لگیں اور افریقہ کی سلطنت سیرینا بھی ان کے ہاتھ آگئی اہل روما کے زمانے میں اس سرزمین نے جس قدر ترقی کی وہ اہل نظر سے مخفی نہیں،

اس کے بعد جب اہل روما کا زوال شروع ہوا تو بازنطینی حکومت نے جو شرق و غرب کے گوشہ میں قائم تھی۔ اس پر قبضہ کیا، لیکن یہ قبضہ زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا۔ اور عربوں کی فوجوں نے تمام افریقہ، مصر، سیرینا، ٹیونس، الجزائر،

مراکش اور اندلس پر پرچم اسلامی لہرا دیا — یہ دوسری پیشین گوئی تھی، ارسطو کی، جو صحیح نکلی۔ عربوں نے اس پر قابض ہو کر اس کا نام قیروان رکھا تھا۔

اس کے بعد جب ترکوں کی حکومت وسیع ہوئی تو عربوں کی جگہ انھوں نے لیبیا اور قیروان ولایت عثمانیہ میں شامل ہو گیا۔ یہ تیسری پیشین گوئی تھی جو صحیح ثابت ہوئی۔

اس کے بعد جب ترکوں کی حکومت ضعیف ہوئی تو اطالیہ نے طرابلس الغرب کے نام سے اپنی نو آبادی قائم کرنا شروع کی اور چاہا کہ سیرینایا قیروان میں پھر اپنی کھوئی ہوئی حکومت قائم کریں۔ چونکہ دولت عثمانیہ کمزور ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اطالیہ کی اس خواہش کا مقابلہ نہ کرسکی۔ اور قیروان کو خود وہیں کے باشندوں کے سپرد کر کے واپس آگئی۔

ہر چند اس کے بعد کامل دس سال تک اہل قیروان نے حکومت اطالیہ کا مقابلہ کیا۔ لیکن آخر کار وہاں اطالوی اثر قائم ہو ہی گیا۔ اور اس طرح یہ چوتھی پیشین گوئی بھی پوری ہوئی کہ تیسری بار مشرقی حکومت کے بعد پھر اہل روما کی حکومت دوبارہ ہو گئی۔

اب صرف آخری پیشین گوئی باقی رہ گئی ہے کہ اہل روما کے پاس سے پھر یہ سلطنت کسی مشرقی حکومت کے پاس جائے گی۔ اب دیکھئے کہ یہ مشرقی حکومت کون ہے — ؟

حسنِ نائب

خادمہ، ملکۂ تیودورا کے حضور میں آئی۔ جھک کر آداب بجا لائی اور آگے بڑھ کر ملکہ کے کان میں آہستہ سے کہا — "میکائیل"

تیودورا نے اپنا سر اٹھایا اور پوچھا "بڑا یا چھوٹا؟"

خادمہ نے جواب دیا "اے ملکہ عالم! بڑا"

ملکہ نے کہا "بہتر ہے بلاؤ —" خادمہ چلی گئی۔

ملکہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بچے کو جو اس کے قدموں پر پڑا سو رہا تھا قریب کے پنجرے میں لے جا کر بند کر دیا۔ اور واپس آ کر اس کمرے میں جس کا دریچہ سمندر کی طرف کھلتا تھا۔ مخمل و حریر کے گدوں اور تکیوں پر جا کر لیٹ رہی۔

اسی وقت ایک کشیدہ قامت نوجوان اندر داخل ہوا جس کی آنکھیں نیلگوں تھیں اور بال بھورے۔ یہ دوزانو ہوا۔ ملکہ نے اپنا خوبصورت ہاتھ آگے بڑھایا، اور اس نے اپنے لبوں سے لگا یا۔ ہنوز یہ رسم ختم نہ ہوئی تھی کہ ملکہ نے اپنی آغوش کھول دی اور آخر کار وہ اظہار شیفتگی جس کی ابتدا ملکہ کے ہاتھوں سے ہوئی تھی اس کے سینہ و گردن، شانہ و رخسار تک پہنچنے سے قبل ختم نہ ہو سکا۔

میکائیل نے انتہائی حزن و ملال کے ساتھ "کیا یہ صحیح ہے کہ ملکۂ عالم اب میری

حاضری کو پسند نہیں فرماتیں اور قصر کے اندر میرا آنا شاق گزرتا ہے۔ اگر یہ غلط نہیں ہے تو کیا میں اس کا سبب معلوم کر سکتا ہوں۔ کیا مجھے بتایا جا سکتا ہے کہ عنایات شاہانہ میں یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا ؟

تیودورا نے میکائیل کا سر اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر کہا "اے میکائیل میرے دل میں تیری محبت بدستور قائم ہے۔ لیکن بعض دفعہ واقعات و حالات کچھ ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان کا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔

تجھے معلوم ہے کہ اس قصر میں داخل ہونے سے قبل سلطنت بازنطینی کی ملکہ بننے سے پہلے ہی میں تجھ سے محبت کرتی تھی۔ اور ملکہ ہونے کے بعد بھی کوشش کر کے میں نے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ تو آزادی کے ساتھ مجھ سے ملتا رہے لیکن اب ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ میں اپنے اور تیرے دونوں کے انجام سے ڈرنے لگی ہوں۔"

میکائیل۔ "وہ کیا حادثہ ہے۔"

ملکہ۔ "چند دن ہوئے تیرا بھائی آیا اور مجھ سے ملنے کی درخواست کی۔ چونکہ اس کا نام بھی میکائیل ہے، اس لئے میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ تو ہی ہے، اجازت دیدی"

میکائیل۔ "(گھبرا کر) پھر کیا ہوا ؟"

ملکہ۔ "اس نے مجھ سے اظہار محبت کیا"

میکائیل۔ "پھر ؟"

ملکہ۔ "میں نے اس سے کہا کہ فوراً یہاں سے نکل جائے۔ لیکن اس نے جاتے ہوئے غضب ناک ہو کر دھمکی دی اور کہا کہ میرے اور تیرے تعلق کو وہ تمام شہر میں

مشتہر کرے گا اور بادشاہ سے بھی جا کر کہے گا" اس لئے اس واقعہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تو اس وقت تک قصر میں آمد و رفت بند کر دے، جبتک ....

میکائیل ۔ "جب تک ؟"

ملکہ ۔ "ہاں ! جب تک کہ تیرا بھائی اس ارادے سے باز نہ آجائے یا راستہ بالکل صاف نہ ہو جائے" میکائیل نے یہ سنا اور انتہائی غیظ کے عالم میں دیوانہ وار وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

(۲)

تیوڈورا کا باپ جانوروں کا ڈاکٹر تھا اور اس کی ماں کا نام کسی کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ کون تھی اور کیا تھی جب اس کا باپ مر گیا تو وہ بہت کمسن تھی دنیا اس پر تنگ ہوئی تو حصول معاش کے لئے اس نے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جو ایک خاندان بربادحسین عورت اختیار کر سکتی ہے۔ وہ تماشہ گاہوں میں ناچتی تھی ہوٹلوں میں جا جا کر گاتی تھی، سڑکوں پر اگلیوں میں اپنے پر شباب اعضاء کی نمائش سے لوگوں کو لبھایا کرتی تھی۔ اسی زمانے میں اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اس کے انجام سے ڈر کر اس نے اپنی آوارہ زندگی کو ترک کر کے ایک دکان قائم کر لی جہاں وہ عورتوں کے کپڑے وغیرہ سیا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کے ماضی کو بھلا دیا اور طبقہ امرا کی عورتیں بھی اس کی دکان پر آنے جانے لگیں اتفاق سے اسی دوران میں سلطنت کے ولی عہد (یوستی نیانوس) نے اسے دیکھ لیا اور اس پر مائل ہو گیا۔

ولی عہد کی نسبت کسی اور جگہ ہو چکی تھی اور اپنے مرتبہ کے لحاظ سے وہ بھی

تیودورا سے شادی نہ کرسکتا تھا۔ جس کا ماضی اس قدر بدنام تھا لیکن ایک تو ولی عہد خود فطرتاً بہت آزاد طبع واقع ہوا تھا، دوسرے اسی زمانے میں جدید قانون کے رو سے شاہی خاندان کے افراد کو شادی کے مسئلہ میں پوری آزادی دیدی گئی تھی۔ اس لئے تخت نشین ہوتے ہی اس نے تیودورا سے نکاح کرلیا اور اسے بازنطینی سلطنت کی ملکہ بنا دیا۔

کچھ عرصہ تک تو جاہ و ثروت سلطنت و حکومت کے نشہ نے تیودورا کو مدہوش رکھا۔ لیکن جب وہ تھک گئی تو اس کو پھر اپنا وہی دور آزادی یاد آنے لگا اور تمام وہ جذبات جوانی جن کو واقعات نے افسردہ کر دیا تھا۔ از سر نو تازہ ہوگئے چنانچہ اس نے اپنے تمام قدیم عشاق کو آہستہ آہستہ بلانا شروع کیا اور چند دن میں قصر حکومت اچھا خاصا معصیت گاہ بن گیا۔

انھیں عشاق میں دو بھائی میکائیل کبیر و میکائیل صغیر بھی تھے جو پوشیدہ طور پر ملکہ سے آکر ملا کرتے تھے لیکن ایک کو دوسرے کی آمد کی اطلاع نہ ہوتی تھی ایک دن میکائیل کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ ملکہ اس کے بڑے بھائی سے بھی ملتی ہے اور زیادہ التفات سے ملتی ہے۔ اس لئے وہ نہایت برہمی کے عالم میں ملکہ کے پاس گیا اور کہا کہ۔ اگر میرے بھائی کی آمد و رفت یہاں بند نہ کی گئی تو میں یہ تمام راز دنیا پر افشا کر دوں گا۔

یہ سن کر ملکہ اس وقت تو خاموش ہوگئی لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح اس کانٹے کو راستہ سے دور کرنا ہے۔

(۳)

ملکہ اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی کہ خادمہ جو اس کے تمام رازوں سے آگاہ ہے حاضر ہوتی ہے اور میکائیل کے آنے کی اطلاع دیتی ہے۔

ملکہ چونک کر پوچھتی ہے۔ "بڑا؟" اور پھر ملکہ کے چہرے سے جواب کو پڑھ کر مسکرا کر کہتی ہے۔ "ہاں بلا لاؤ۔ میں تو انتظار ہی کر رہی تھی۔"

میکائیل آیا اور ملکہ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا "جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اس وقت تک مچھلیاں اس کے جسم کو کھا چکی ہوں گی۔"

ملکہ نے گھبرا کر پوچھا "کیا واقعی تو نے اسے قتل کر دیا۔"

میکائیل نے کہا "ہاں قتل کر دیا، اور اس کے جسم کو دریا میں ڈال دیا۔"

یہ سن کر ملکہ نے اپنی آغوش کھول دی اور دونوں کے لب ایک دوسرے سے مل گئے۔ اس حال میں کہ ان کے جسم سے آگ کی سی حرارت پیدا ہو رہی تھی۔

اس وقت کہ دونوں ریشم کے نرم نرم گدوں پر لیٹے ہوئے ہیجان نفس کی انتہائی کیفیات میں ڈوبے ہوئے تھے، ملکہ کی نگاہ میکائیل کی ہتھیلی پر پہنچ گئی، اور اس نے خیال کیا کہ اس پر خون کا دھبہ موجود ہے۔ اس کے بعد اس نے میکائیل کی دوسری ہتھیلی کو دیکھا۔ چہرہ کو دیکھا، گردن کو دیکھا اور ہر جگہ اسے خون کے بڑے بڑے دھبے نظر آنے لگے۔

اس وقت تک تیوڈورا خدا معلوم کتنے جرائم کی مرتکب ہو چکی تھی۔ لیکن یہ اس کی زندگی کا پہلا موقعہ تھا کہ اس کے ضمیر نے اس کے جرم کو اس طرح پیش کیا ہو۔ گذشتہ زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ رہے تھے

اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی آواز اس کو ملامت کر رہی ہے اور اس کا دل کانپا جا رہا ہے۔

(۴)

کامل چھ ماہ گذر گئے ہیں کہ ہزاروں معمار باسفورس کے ساحل پر ایک عظیم الشان عمارت کی تکمیل میں رات دن مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ عمارت ملکہ تیودورا کے حکم سے تعمیر ہو رہی ہے جس میں ۵۰۰ آدمیوں کے قیام کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس وقت یہ مکمل ہو گئی تو ملکہ نے تمام ملک میں اعلان کیا کہ جو عورتیں گناہوں سے تائب ہو کر عصمت و عفت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں وہ آئیں اور اس عمارت میں قیام کریں چنانچہ اس نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی عورتیں اس مکان میں جمع کرنا شروع کیں اور کوشش کر کے ان کی شادیاں شرفا شہر اور امراء دربار سے کر دیں۔

اس عمارت کا نام اس نے "دارالتوبہ" رکھا تھا۔ اس کی نگرانی میکائیل کے سپرد تھی جو خود بھی تائب ہو کر مرتاض زندگی بسر کرنے لگا تھا۔

بادشاہ یوستی نیانوس، بازنطینی تخت حکومت پر ۵۲۷ء سے ۵۶۵ء تک متمکن رہا لیکن اس ۳۸ سال کی مدت میں وہ اس راز سے بالکل ناواقف رہا کہ ملکہ نے دارالتوبہ کیوں قائم کیا تھا۔

دنیا کا ایک انتہائی بد نصیب شہر

یوں تو دنیا میں بہت سے شہر اور ملک ایسے ہیں جن کے لئے انسانوں نے باہم جنگ و خونریزی سے کام لیا۔ لیکن اس باب میں زامورہ کو جو تاریخی خصوصیت حاصل ہے وہ شاید ہی دنیا کے کسی مقام کو حاصل ہوئی ہو۔

اس بد نصیب شہر کا محاصرہ کتنی دفعہ ہوا۔ کتنی مرتبہ اس کی گلیوں میں انسانی خون پانی کی طرح بہایا گیا اور کتنی بار اس کی فضا لاشوں کے ڈھیر سے متعفن ہوئی اس کا جواب دینا مشکل ہے۔ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ بیس مرتبہ تو اہل عرب نے حملہ کر کے "جلالقہ" کے قبضہ سے اسے نکالا۔ اور بیس ہی مرتبہ "جلالقہ" نے عربوں سے اسکو چھینا۔ یہاں تک کہ آج تاریخ میں اس کا نام "آتش و آہن" کے حرفوں سے لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی مسماریاں و بربادیاں اب بھی ان واقعات کو دہرا رہی ہیں اور وہاں کے آثار اور ویران قلعے ان تمام دردناک داستانوں کی زندہ تصویریں ہیں۔

عرب یہاں فاتحانہ داخل ہوئے۔ لیکن الفونزو ہسپانوی نے پھر ۷۴۸ء میں اسے چھین لیا۔ اس کے بعد ۸۱۳ء میں دوبارہ اہل عرب قابض ہوئے اور پھر یہ مقام ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۹۳۹ء میں عبدالرحمٰن ناصر نے پھر واپس لیا مگر

اہلِ ہسپانیہ دوبارہ اس پر قابض ہوگئے۔ الغرض اسی طرح بارہا عرب کا قبضہ یہاں ہوا اور ہر بار سنہ ۹۶۳ء اور سنہ ۹۸۴ء میں ان کو یہاں سے ہٹنا پڑا۔ یہاں تک کہ عہد فرڈینانڈ داول میں جو لقب "کبیر" سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ مقام مستقلاً حکومت اسپین میں داخل ہوگیا اور سنہ ۱۰۶۵ء میں اس نے یہ شہر اپنی حسین و محبوب بیٹی ڈونیا اوراکا کو ہدیہ میں دے دیا۔

لیکن چونکہ اس بدنصیب شہر کی قسمت ہی میں بربادی و خونریزی لکھی ہوئی تھی اور اس سے قبل عرب و جلالقہ وغیرہ کے خدا معلوم کتنے بچے کتنے بوڑھے اور کتنی عورتیں یہاں ذبح کی جا چکی تھیں۔ اس لئے یہاں کے خونریز و خوں آشام دیوتا نے اس مرتبہ بھی بڑی قربانی طلب کی اور جب سنہ ۱۰۶۵ء میں فرڈیناند مر گیا تو اوراکا کے بھائی نے اس شہر پر قابض ہونے کے لئے جنگ شروع کر دی یعنی اگر اس سے قبل عرب و اہلِ اسپین باہم دست و گریباں نظر آتے تھے۔ تو اب خود اہلِ ہسپانیہ آپس ہی میں اس بدبخت شہر کے لئے خوں ریزی پر آمادہ ہوگئے۔

اس وقت زاموره، جلالقہ اور عرب کی ملی ہوئی آبادی پر مشتمل تھا اور ان دونوں کے تعلقات باہم اس قدر اچھے ہوگئے تھے کہ کوئی امتیاز نسل و مذہب کا باقی نہ رہا تھا۔ اور ان لوگوں میں زاموری ہونے کی نسبت اس قدر قوی ہوگئی تھی کہ وہ اس کے سامنے کسی اور فرق و امتیاز کو دیکھتے ہی نہ تھے۔ اسی لئے جب کوئی لشکر زاموره پر حملہ آور ہوتا تھا تو تمام آبادی، بلاتفریق مذہب و نسل متحد ہو جاتی تھی۔ اور کوشش کرتی تھی کہ قتل و خونریزی تک نوبت نہ پہنچے۔

اس لئے جس وقت فرڈیناند کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا تو اس نے

زامورہ کی طرف جو اس کی بہن کے قبضہ میں تھا فوجیں روانہ کیں اور حکم دیدیا کہ شہر کا محاصرہ اس وقت تک برابر جاری رکھا جائے۔ جب تک شہر کے دروازے نہ کھول دئے جائیں۔ اور قلعہ پر قبضہ نہ ہو جائے۔ اہل زامورہ حاکم شہر کے پاس گئے اور اس سے التجا کی کہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے دروازے کھول دئے جائیں اور بھائی بہن کی جنگ میں غریب اہل شہر کو قتل و ذبح کی مصیبت میں نہ مبتلا کیا جائے۔ لیکن حاکم شہر نے ان کی التجاؤں پر توجہ نہیں کی پورے عزم کے ساتھ مقابلہ کا ارادہ کر لیا۔

(۲)

فریقین کے لشکر کو میدان جنگ میں چھوڑئے اور زامورہ کی فصیل و خندق کے گرد جو انسانی خون بہ رہا ہے اس سے قطع نظر کر کے تھوڑی دیر کے لئے شہر کے اندر آئیے اور دیکھئے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

ایک مکان سے جو گلی میں واقع ہے نہایت ہی دردناک آواز آرہی ہے، لیکن اس طرح جیسے کوئی تکلیف کو برداشت کرتے کرتے مجبور ہو جانے پر بھی پوری آزادی سے فریاد نہ کر سکے۔ یہ مکان محمد بن عبداللہ اموی کا ہے اور یہ آواز اسی کے خاندان میں سے کسی فرد کی ہے۔

کسی وقت یہ خاندان بھی بڑا خاندان تھا اور محمد بن عبداللہ جب جنگ کے لئے باہر نکلتا تھا تو کم از کم بیس کی تعداد میں اس کے بیٹے پوتے وغیرہ گھوڑوں پر سوار اس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ اور دس بارہ عورتیں ہمرکاب ہوتی تھیں تاکہ زخمیوں کی تیمارداری کریں۔ آخرکار محمد بن عبداللہ ایک جنگ میں کام آگیا اور

رفتہ رفتہ اس کے بیٹے پوتے بھی اسی طرح ختم ہو گئے۔ اب اس گھر میں ایک چہل سالہ عورت جو محمد بن عبداللہ کی نواسی ہے۔ سکونت پذیر ہے۔ اس کی ایک لڑکی فاطمہ ہے جس کی عمر دس سال کی ہے اور ایک لڑکا ہے جو عمر کے آٹھویں سال میں ہے۔ فاطمہ کا باپ ایک بار جو شکار کے لئے باہر نکلا تو واپس نہیں آیا، غالباً ڈاکوؤں نے اُسے مار ڈالا۔ اسی وقت سے اس خاندان کی تباہیاں شروع ہوئیں۔ خیر فقر و فاقہ کی مصیبت تو تھی ہی قدرت نے صحت بھی ان کی چھین لی اور ماں بیٹے دونوں صاحب فراش ہو کر حرکت سے مجبور ہو گئے۔ فاطمہ ہنوز اُٹھ بیٹھ سکتی تھی اور حیران تھی کہ اس فقر و فاقہ کی بلا کو کس طرح سے دور کرے اور اپنی بیماریاں اور دم توڑنے والے بھائی کے لئے کہاں سے کھانے کا انتظام کرے۔

ایک رات معصوم فاطمہ باہر نکلی اور شہر پناہ سے گذر کر محاصرہ کرنے والی فوج کے کیمپ میں داخل ہو گئی۔ جب وہ سپہ سالار کے خیمہ کے قریب پہنچی تو سنتری نے اسے روک کر پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ: "میں سپہ سالار سے ملنا چاہتی ہوں کیونکہ ایک نہایت ضروری بات مجھے اس سے کہنا ہے۔"

یہ سپہ سالار روڈرج بیوار تھا جو تاریخ اسپین میں غیر معمولی شہرت رکھتا تھا۔ اور جو اپنی شجاعت و اقدام کی وجہ سے اہل عرب میں بھی سید کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ سنتری نے یہ سن کر اسے جانے کی اجازت دیدی اور چند منٹ میں وہ ایک شخص کے سامنے پہنچ گئی جس کے چہرے پر سوائے داڑھی کے اور کوئی چیز نظر ہی نہ آتی تھی۔ اس نے لڑکی کو تھوڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ دیکھا اور پھر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد بھی دیر تک وہ فاطمہ کو دیکھتا رہا اور پھر پوچھا کہ:-

کیا چاہتی ہے ؟"

فاطمہ نے کہا ۔" میں ایک عرب کی بیٹی اور ایک عرب کی پوتی ہوں اور شہر زامورہ ہی کی روشنی میں میں نے آنکھ کھولی اور یہیں پرورش پائی۔ میرا خاندان اس زمانے سے مقیم ہے جب عبدالرحمن ناصر نے یہاں فاتحانہ داخل ہو کر اسلامی جھنڈا نصب کیا تھا۔ اور آج تک محمد بن عبداللہ اموی اپنے مورث اول کے دین اور اس کی تعلیمات سے ہمارے خاندان کے کسی فرد نے انحراف نہیں کیا۔ اس خاندان کا ایک ایک فرد زامورہ کی حفاظت و حمایت میں — فنا ہو چکا ہے۔ اور اب سوائے میرے جسے آپ اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں یا ایک صاحب فراش ۴۰ سالہ عورت کو جو میری ماں ہے اور ایک آٹھ سال کا لڑکا جو میرا بھائی اور قریب الموت ہے۔ کوئی اور شخص خاندان میں باقی نہیں رہا۔ ہم لوگ اب ننگے ہیں، بھوکے ہیں، بیمار ولاچار ہیں اور شاید صرف چند دن کے مہمان۔ لیکن اے سردار میں آپ سے روٹی طلب کرنے نہیں آئی۔ کپڑے کا سوال کرنے نہیں آئی، کیونکہ دست سوال دراز کرنے سے بہتر یہ ہے کہ انسان مر جائے۔ بلکہ میں آپ سے ایک چیز طلب کرنے آئی ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو شہر سے نکل جانے کی اجازت دے دی جائے اور اہل لشکر کو ہدایت کر دی جائے کہ وہ ہمارے مزاحم نہ ہوں۔ میں اس عنایت کے عوض میں آپ کو ایک زمرد کا ٹکڑا دوں گی، جو اب تنہا یادگار ہمارے خاندان کے زمانۂ ثروت کی باقی رہ گیا ہے۔ آپ یہ زمرد قبول کیجئے اور اس کے عوض مجھے ایک گھوڑا دیجئے تاکہ اس پر اپنی بیمار ماں اور صاحب فراش بھائی کو بٹھا کر لے جاؤں۔"

یہ سن کر سردار کچھ دیر خاموش رہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر بولا کہ "لاؤ زمرد مجھے دو۔ تمہاری خواہش پوری کر دی جائے گی۔" فاطمہ نے اپنی مٹھی کھول کر زمرد کا ٹکڑا سردار کو دیا اور بولی کہ "لو یہ تمہارے گھوڑے کی قیمت ہے۔ میں کسی ہسپانوی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتی۔"

(۳)

فاطمہ اپنی ماں اور بھائی کو گھوڑے پر سوار کر کے خود بھی پیدل ساتھ چل رہی ہے۔ اور تین سوار ہسپانوی لشکر کے حفاظت کے لئے ساتھ ہیں۔ جب لشکر کے حدود سے یہ مختصر سا قافلہ گذر گیا اور مزاحمت کا اندیشہ باقی نہ رہا تو یہ لوگ ایک جگہ رکے اور ان تین سواروں میں سے ایک سوار آگے بڑھ کر فاطمہ سے مخاطب ہوا کہ "اے لڑکی تو نے ایک گھوڑا خرید کر اپنی ماں اور بھائی کو سوار کر دیا اور باوجود ہمارے اصرار کے تو نے اپنے لئے کوئی سواری قبول نہ کی اور پیدل چلنا ہی گوارا کیا۔ اب ہم تم جدا ہو رہے ہیں۔ میں ایک التجا تجھ سے کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تو قبول کرے گی۔"

یہ کہہ کر سوار نے نقاب چہرے سے اٹھائی تو فاطمہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ تو خود سپہ سالار ہے جس سے اس نے گفتگو کی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے زمرد کا ٹکڑا فاطمہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ "اس کو اپنے ہی پاس رکھو کیونکہ یہ تمہارے خاندان کی عزیز یادگار ہے۔ اور میں بھی اس یادگار کا احترام کرتا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اہلِ عرب جو مجھے سیّد کے لقب سے یاد کرتے ہیں واقعی خود بھی سردار و سید ہیں اور ان کی یادگار کا احترام مجھ پر واجب ہے۔"

فاطمہ نے آنکھوں سے آنسو ٹپکاتے ہوئے زمرد واپس لیا اور بولی کہ:-
"اے سردار واقعہ یہ ہے کہ جنھوں نے تجھے سید کا لقب دیا انھوں نے غلطی نہیں کی، تو واقعی اسی کا مستحق تھا۔"
یہ کہہ کر فاطمہ نے اپنا راستہ اختیار کیا اور زامورہ کو آگ اور خون سے کھیلنے کے لئے ہمیشہ کے واسطے اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔

وصل بعد وصال

نومبر ۱۸۴۸ء کی آٹھویں تاریخ ہے اور امیر عبدالقادر جزائری معہ اپنی بیویوں لڑکیوں، اور اعوان وانصار کے شہر امبوزا کے اندر ایک عالی شان قصر کے اندر فروکش ہیں جسے حکومت فرانس نے ان کے قیام کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

امیر عبدالقادر جزائری وہی وطن پرست دغیور امیر تھا جس نے اپنے ملک اور اپنے آباؤ اجداد کی روایات شجاعت کی حمایت میں ایک زمانہ تک فرانسیسی فوجوں سے جنگ کی اور اگر دس بار خود شکست کھائی تو پانچ مرتبہ دشمن سے بھی اپنی تلوار کا لوہا منوا چھوڑا — لیکن فرانس کی زبردست حکومت دمنظم فوج سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا، آخر کار اہل فرانس بلاد غربی میں ساحل سے لے کر ریگستانوں تک وسیع حصۂ زمین پر قابض ہو گئے اور ۲۸ راگست ۱۸۴۷ء کی شام کو امیر عبدالقادر اپنی تلوار، دشمن کے حوالے کرنے پر مجبور ہو ہی گیا — ہرچند عساکر فرانس کے جنرل نے امیر موصوف سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے آپ کو حوالے کر دیں گے تو ان کو اجازت دے دی جائے گی وہ شرقی دیار عرب میں جہاں چاہے چلے جائیں۔ لیکن حکومت فرانس اس عہد پر قائم نہ رہی اور انھیں فرانس بھیج دیا جہاں وہ قصر امبوزا میں ایک قیدی کی حیثیت سے رکھے گئے۔ یہاں یہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۲ء تک رہے اور

۱۸۵۲ء میں جب انقلابی دور فرانس میں شروع ہوا تو امیر عبدالقادر دمشق چلے آئے اور یہیں وفات پائی۔

ان لوگوں میں سے جنھوں نے امیر عبدالقادر کا ساتھ دیا تھا اور جو ان کے ساتھ امبوزا میں نظربند تھے ایک شخص عبدالسمیع مغربی بھی تھا۔ اس نے جس طرح امیر کا ساتھ ان کے ایام کامیابی میں دیا تھا۔ اسی طرح ادبار میں بھی دیا اور امیر کی محبت ترک کرنا کسی طرح گوارا نہ کیا۔ امیر بھی اس سے محبت کرتے تھے اور ان کو پوری طرح احساس تھا کہ اس نے محض ان کی محبت میں اپنے وطن اور اہل وعیال سب کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ عبدالسمیع، امیر سے کہا کرتا کہ "اے میرے آقا، میں نے اپنے قلب کے دو ٹکڑے کر لئے ہیں اور ایک خدا کے لئے وقف ہے۔ اور دوسرا آپ کے لئے ہے۔" لیکن اسے خبر نہ تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب اسے اپنے قلب کے تین حصے کرنا پڑیں گے اور ایک حصہ کسی اور ہستی کے لئے وقف کرنا ہوگا۔

یہ ہستی ایک نوجوان فرانسیسی لڑکی کی تھی جس کا نام ایلس فونتان تھا۔ یہ لڑکی ایک خادمہ کی حیثیت سے امیر کے قصر میں کام کرتی تھی اور یہیں دونوں کے درمیان پیمان محبت استوار ہوگیا تھا اور اس نے بھی اپنے محبوب کے ساتھ اسیری کی زندگی اختیار کر لی تھی۔

اتفاق سے ایک دن یہ لڑکی اپنے والدین واعزہ سے ملنے گھر گئی تو انھوں نے اس کو قید کر لیا اور پھر نہ جانے دیا۔ کیونکہ ان کو اس کے تعلق خاطر کا حال معلوم ہوگیا تھا اور وہ کسی طرح گوارہ نہ کرتے تھے کہ وہ ایک غیر مذہب و غیر ملک کے انسان سے

وابستگی پیدا کرے ۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "ہم کو تیری موت گوارا ہے لیکن غیر کفو میں شادی کرنا کسی طرح منظور نہیں" ۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی عہد کیا کہ وہ امیر اور عبدالسمیع دونوں سے اس کا انتقام لیں گے ۔

ہفتوں گذر گئے اور وہ لڑکی قصر تک واپس نہ آسکی ۔ عبدالسمیع کا تردد بڑھتا جا رہا تھا اور حیران تھا کہ اس کی غیر حاضری کا سبب کیا قرار دے ۔ آخر کار اس نے دوسری لڑکیوں سے تحقیق حال کی اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی محبوبہ مقید ہے اور ہر وقت ملول و حزیں رہتی ہے تو اس کی تکلیفیں اور بڑھ گئیں ۔

(۲)

نومبر ۱۸۵۱ء کی پانچویں تاریخ صبح کو جب اہل قصر کی آنکھ کھلی تو سنا کہ پائیں باغ کی سمت سے فریاد و زاری کی آواز آرہی ہے ۔ سب لوگ دوڑ پڑے اور دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی رات کے لباس میں لوٹتی ہوئی چلی آرہی ہے اس حال میں کہ اسکے سینہ اور پہلو سے خون جاری ہے ۔ لوگ اس کو فوراً قصر کے اندر لے آئے اور علاج میں مصروف ہو گئے ۔ یہ لڑکی زخموں کی تکلیف سے بیتاب تھی ۔ درد سے تڑپ رہی تھی ، لیکن عبدالسمیع کا نام ہر وقت اس کی زبان پر تھا لوگ حیران تھے کہ یہ کیا قصہ ہے ابھی تک عبدالسمیع کو بالکل علم نہ تھا کہ کون لڑکی کس حال میں قصر کے اندر آئی ہے جب عبدالسمیع نے یہ خبر سنی تو وہ بھی محض تماشائی کی حیثیت سے اس کو دیکھنے گیا ، مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ تو اس کی محبوبہ تھی جس کے لئے وہ ہر وقت مضطرب رہا کرتا تھا اور جس کے دفعتاً غائب ہو جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی وہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا اور دیوانوں کی طرح اس کا مجروح سینہ

اور غم آلود چہرہ چومنے لگا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ جب جوش کم ہوا تو عبدالسمیع نے بھی محسوس کیا کہ وہ مشرقی روایات و تہذیب سے ہٹا جا رہا ہے اور اس لئے اس نے آہستگی سے لڑکی کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور خاموش الگ کھڑا ہو گیا۔

جب اس کے ساتھیوں نے پوچھا کہ "تمھاری شناسائی اس لڑکی سے کیونکر ہوئی اور اس بے تکلفی و بے حجابی کے کیا معنی ہیں۔" تو اس نے کہا کہ "میں امیر کے روبرو تمام واقعات بیان کروں گا اور اگر مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے تو امیر ہی کے حضور میں سزا کو قبول کروں گا۔"

(۴)

جب امیر عبدالقادر کو اطلاع ہوئی تو حکم دیا کہ دونوں سامنے لائے جائیں چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور ان دونوں نے اپنی داستان محبت کو شروع سے آخر تک دہرایا لڑکی نے گھر میں قید کر لئے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ "اے امیر آج میں نے گھر سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ خدا معلوم میرے بھائی کو کس طرح خبر ہو گئی اور اس نے مجھے راستہ میں پکڑ کر اصرار کیا کہ پھر گھر واپس جاؤں، لیکن جب میں کسی طرح راضی نہ ہوئی تو اس نے اپنا خنجر نکال کر میرے پہلو اور سینہ میں پیوست کر دیا۔ میں گر پڑی اور مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا۔"

لڑکی نے یہ کہا اور دفعتاً اس کی گردن شانہ کی طرف ڈھلنے لگی۔ حتیٰ کہ چند لمحوں کے اندر وہ زمین پر گر پڑی اس حال میں کہ اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اور اس کا جسم سرد ہو گیا تھا۔

امیر عبدالقادر نے حکومت سے اس لڑکی کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے

کی اجازت حاصل کر کے اسے قصر کے جوار میں سبز سایہ دار درختوں کے نیچے مدفون کر دیا اور دیر تک اس واقعہ سے متاثر رہا۔

(۴)

۱۱ ستمبر کی صبح کو امیر عبد القادر معہ اپنے ساتھیوں کے امبوز سے کوچ کی تیاریاں کر رہے ہیں کیونکہ حکومت فرانس نے ان کو آزاد کر دیا ہے اور اجازت دیدی ہے کہ جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ امیر جب اہتمام سفر سے فارغ ہو کر اپنے ساتھیوں کا جائزہ لینے لگا تو معلوم ہوا کہ عبد السمیع ان میں موجود نہیں ہے۔

امیر نے جستجو کی تو دیکھا کہ عبد السمیع اپنے کمرے میں مردہ پڑا ہوا ہے اور ایک تحریر اس کے سینے پر رکھی ہوئی ہے۔ جس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ :۔

اے امیر میں الیس تونتان کو تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لئے جائیے تو مجھے اس کے پاس دفن کر کے جائیے۔"

(۵)

چنانچہ آج بھی فرانس کے شہر امبواز میں اگر کوئی سیاح جائے اور مسلمانوں کے قبرستان کی سیر کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ ایک گوشہ میں چند درختوں کے نیچے ایک قبر زرد پتھر کی پائی جاتی ہے جس کے سرہانے سنگ مرمر کی تختی نصب ہے یہی ہے الیس تونتان اور عبد السمیع کی قبر جہاں وہ کبھی نہ جدا ہونے کے لئے ہمیشہ کے واسطے ایک دوسرے سے مل گئے ہیں۔

تاجدار رقاصہ

آج قصرِ فرعون، دلہن کی طرح سجا ہوا ہے اور جوق در جوق تماشائی ہر چار طرف سے کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں۔ فوج کے مسلح سپاہی باقاعدہ دروازوں پر کھڑے ہوئے نگرانی کر رہے ہیں۔ موسیقی کی آوازیں مختلف خوشبوؤں کے ساتھ لپٹی ہوئی اندر سے آ آ کر باہر کے تماشائیوں کے کانوں تک پہنچ رہی ہیں۔ جب کوئی کاہن یا سردار اندر داخل ہوتا ہے تو لوگوں کی صفیں پھٹ جاتی ہیں اور ان پر ہر طرف سے پھول برسائے جاتے ہیں۔ آج فرعون نے جشنِ طرب برپا کیا ہے اور اپنے ملک کے تمام اکابر کو دعوتِ شرکت دی ہے۔

فرعون، امنحوتپ چہارم اپنے طلائی جڑاؤ تخت پر پوری شان فرعونیت کے ساتھ جلوہ گر ہے، چاروں طرف امرا حلقہ کئے ہوئے ہیں، رامشگر رقص و سرود میں مصروف ہیں۔ اور ہر طرف "فرعون زندہ باد" کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔

فرعون کے پہلو میں اس کی ماں ملکۂ یتی بیٹھی ہوئی ہے جو امنحوتپ ثالث کی بیوی تھی۔ امنحوتپ ثالث، فراعنۂ مصر میں نہایت ہی بہادر و قوی فرعون گذرا ہے اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی تیر ایسا نہیں چلایا جو نشانہ پر جا کر بھرپور نہ بیٹھا ہو۔ میدان جنگ میں اس کی شجاعت بجلی کا سا کام کرتی تھی، اور

جب شکار کو جاتا تھا تو صحرا کا صحرا درندوں سے خالی ہو جاتا تھا۔ اس نے دس سال کے عرصہ میں علاوہ بہت سے درندوں کے ایک سو بارہ شیر اپنی تلوار سے ہلاک کئے۔ اس کا بیٹا امنحوتپ چہارم بھی اپنے باپ کی طرح فتح ممالک کا شایق تھا، لیکن اس کا طریق کار جدا تھا اس کے اسلحہ کچھ اور تھے اس کا باپ تو تیر و تبر۔ تیغ و خنجر۔ نیزہ و کمان سے کام لے کر دشمنوں کو مغلوب کرتا تھا۔ لیکن اس نے نئے دین اور نئے عقائد کا اجرا کر کے لوگوں کی روح کو مفتوح کرنا چاہا اس نے کاہنوں کے اقتدار اور خدائے آمون کے پرانے معابدوں کو مٹا کر نئے ہیکلوں کی بنیاد ڈالی اور اسی وقت سے اس کا نام اخناتون ہو گیا۔

لیکن اس وقت جو جشن اس نے ترتیب دیا اس کا تعلق کسی مذہبی رسم سے نہ تھا بلکہ فرمانروائے سوریا و شرقیہ کے ایلچی کی پذیرائی کے لئے تھا، امنحوتپ کی ماں ملکہ تیتی نے ارادہ کیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لئے اپنے ہی باج گذار بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کی بیٹی کو تلاش کرے، اور چونکہ شاہ سوریا کی بیٹی حسن و جمال کے لحاظ سے اسوقت آشوب زمانہ بنی ہوئی تھی، اس لئے اس نے وہیں پیام دیا اور اس وقت وہیں کا ایلچی ہدایا وغیرہ لے کر آیا تھا تاکہ رسم نسبت ادا کی جائے اور شاہ سوریا کی بیٹی تادو۔ اخناتون کے رشتہ ازدواج میں آکر ملکۂ مصر بنے۔

(۲)

شاہ سوریا کے ایلچی نے اپنے بادشاہ کا مکتوب پیش کیا اور وہ ہدایا سامنے گذرانے جو اخناتون کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اخناتون نے ان کو نہایت مسرت کیساتھ

قبول کیا اور افسر تشریفات کو حکم دیا کہ جلسہ رقص شروع کیا جائے۔

اس حکم کے سنتے ہی مصر کی بہترین رقص کرنے والی لڑکیاں جو اپنے حسن و جمال اور فن دلربائی کے لحاظ سے نظیر نہ رکھتی تھیں۔ دس دس کی ٹولی میں سامنے آئیں اور اپنی سحر کاریوں سے ہر ہر شخص کو مبہوت بنانا شروع کیا۔ جب ان سب کا رقص ختم ہو گیا تو معلوم ہوا کہ ایک رقاصہ باقی رہ گئی ہے جو تنہا بغیر کسی کی جیت کے اپنے فن کی نمائش کرنا چاہتی ہے۔ فرعون نے حکم دیا کہ حاضر کی جائے۔

وہ اندر داخل ہوئی اور اس ادا سے گویا کہ وہ وادی نیل کی سب سے زیادہ لچکدار ناگن تھی۔ اس نے ناچنا شروع کیا مگر اس انداز سے گویا کہ وہ اپنی ہر ہر حرکت رقصیہ سے کائنات کو الٹ دینا چاہتی ہے۔ اس کی آواز میں اس کی آنکھوں میں اس کے جسم کی ہر ہر جنبش میں، ایک ایسا ملکوتی سحر پنہاں تھا کہ لوگ یہ محسوس کر رہے تھے کہ شاید وہ کسی اور دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہوں۔ رقص ختم ہوا تو اخناتون نے ایک عالم مسرت میں حکم دیا کہ اس کو سامنے لایا جائے۔ وہ ڈری کہ کہیں اس کے رقص کا الٹا اثر تو نہیں ہوا کیونکہ فراعنہ کی بہت سی داستانیں وہ سن چکی تھی، اور متعدد مثالیں اس کے سامنے ایسی تھیں کہ سب سے زیادہ خونریزیاں انھوں نے اسی وقت کیں جب ان کے چہرے مسکرا رہے تھے اور آنکھوں سے مسرت ٹپک رہی تھی۔ وہ سامنے گئی اس طرح ڈرتی ہوئی، کانپتی ہوئی گویا کہ وہ شاخ بید تھی جس سے باد صرصر گذر جائے۔

اخناتون نے کہا "اور قریب آ" اس کو یقین ہو گیا کہ آج خیر نہیں۔ وہ آگے بڑھی لیکن بالکل اس طرح جیسے کوئی جسم بے جان کو کھینچ کر آگے بڑھا دے۔

"اتنا قریب" فرعون نے کہا "اور قریب آ" وہ آگے بڑھی۔ یہاں تک کہ فرعون کے چہرے سے اس کے چہرے کا فاصلہ ایک بالشت سے زیادہ نہ تھا۔

فرعون نے پوچھا "میں نے تجھے اس سے قبل دربار میں نہیں دیکھا تو ابھی آئی ہے۔"

رقاصہ ــــ "اے مالک مجھے یہاں آئے ہوئے کئی مہینے ہوئے"

فرعون ــــ "کیا رقص تجھے بہت مرغوب ہے"

رقاصہ ــــ "اے آقا، جنون کی حد تک"

فرعون ــــ "کیا تو شہر ذار مصر کے کسی خاندان سے تعلق رکھتی ہے"

رقاصہ ــــ "ہاں! اے آقا"

فرعون ــــ "تیرا نام کیا ہے"

رقاصہ ــــ "نفرتیتی"

فرعون ــــ "کس قدر پیارا نام ہے نفرتیتی"

دربار میں سکوت کامل طاری تھا کہ فرعون اٹھا اس نے رقاصہ کے دونوں گالوں پر ہاتھ رکھے اور اس کو دبانے لگے اور زیادہ قریب کھینچ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "اے نفرتیتی تیرے اس خوبصورت سر پر مصر کا تاج کس قدر بھلا معلوم ہوگا"

یہ سنتے ہی رقاصہ کے آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری ہوگئے اور فرعون نے اس کی بالوں کی لٹوں کو چھوتے ہوئے کہا "اے نفرتیتی! تیرے اس خوبصورت سر پر مصر کا تاج کس قدر بھلا معلوم ہوگا"

(۴)

ملکہ تیتی یہ حالات معلوم کرکے بہت فکرمند ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے کو تنہائی میں بلا کر سمجھایا کہ اس طرز عمل سے شاہ سوریا کو سخت تکلیف پہنچے گی اور نقض عہد مناسب نہیں ۔ کاہنوں نے کہا کہ اگر نفرتیتی سے شادی کا ارادہ کیا تو ملک پر بڑی بڑی مصیبتیں نازل ہوں گی ۔ کاہنوں کے سردار نے کہا کہ وہ رسم نکاح کو ادا نہ کرے گا ۔ لیکن ان سب کا جواب اخناتون کے پاس صرف یہی تھا کہ "نفرتیتی کے خوبصورت سر پر مصر کا تاج کتنا بھلا معلوم ہوگا ۔"

ایک مہینہ کے بعد سرزمین مصر نے ایک اور منظر جشن طرب کا دیکھا ۔ جلوس راستہ سے گذر رہا ہے ۔ فوجی دستے مسلح سوار چاروں طرف حفاظت پر مامور ہیں اور شاہ سوریا کی بیٹی زریں رتھ پر سوار قصر فرعون کی طرف جا رہی ہے ۔

اخناتون نے پورے شاہانہ اہتمام کے ساتھ اپنی بیوی کا خیر مقدم کیا ، لیکن اس کی صورت دیکھنے سے انکار کر دیا ۔ ہفتوں پر ہفتے گذر گئے ۔ لیکن اخناتون کسی طرح اس پر راضی نہ ہوا کہ وہ شاہ سوریا کی بیٹی سے خلوت میں ملے ۔ آخرکار ملکہ تیتی نے مجبور ہو کر اسے شاہ سوریا کے پاس اس انعام کے ساتھ واپس کر دیا کہ فرعون بیمار ہے اور اس کی بیماری تعلق ازدواج کے منافی ہے ۔

ٹھیک اس وقت جبکہ تادوزا اپنے باپ کے سامنے سوریا میں اپنی تمام داستان درد دہرا رہی تھی مصر میں ہنگامۂ جشن برپا تھا اور نفرتیتی مصر کا تاج زیب سر کئے ہوئے اخناتون کے پہلو میں حکمرانی کر رہی تھی ۔

(۴)

امنحوتب رابع جس نے انقلاب دینی کے بعد اپنا نام اخناتون رکھ لیا تھا ۳۰ سال کی عمر تک زندہ رہا اور نفرتیتی سے سات لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جن میں سے دوسری لڑکی ایک سردار سے بیاہی گئی جس کا نام توتو تھا اور جو بعد کو توت غنخ امون کے نام سے مشہور ہوا۔

یہی وہ فرعون تھا جس کا مقبرہ چند سال ہوئے دریافت ہوا اور عرصہ تک اخبارات میں موضوع بحث رہا۔

ہندوستان کا ایک کاہن نجومی

[illegible]

وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کے ہر گوشہ میں بدامنی و بے اعتمادی کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ وطن و ملک کی محبت کی جگہ خود غرضی و نفسانیت نے لے لی ہے۔ ہر چہار طرف نفاق و عناد کی آگ مشتعل ہے ایک رئیس دوسرے رئیس کی مایک اجر و دیکر رلچہ کو کھائے جا رہا ہے۔ گوشت سے ناخن جدا ہو رہا ہے اور غریب و مظلوم آبادی آگ اور خون سے گذر رہی ہے۔

انھیں امرا میں ایک امیر ناناصاحب[1] کے نام سے مشہور ہے جو اپنے محلوں میں

---

[1] اس کا اصل نام داندو پنتھ تھا اور باجی راؤ پیشوا کا متبنیٰ تھا۔ ناناصاحب برٹش گورنمنٹ کا مخالف تھا۔ کیونکہ ۸ لاکھ سالانہ کی پنشن جس کے دینے کا وعدہ سرجان مالکم نے باجی راؤ سے کیا تھا روک دی گئی تھی۔ ناناصاحب نے اس عناد کا بدلہ برٹش گورنمنٹ سے اس طرح لیا کہ کانپور میں بہت سی انگریز عورتوں اور ان کے بچوں کو قتل کروا ڈالا۔ بغاوت کے فرو ہونے کے بعد ناناصاحب بھی دوسرے مفروروں کے ساتھ نیپال کی طرف بھاگ گیا۔ اور پھر پتہ نہیں چلا کہ اس کا کیا حشر ہوا

داد عیش دے رہا ہے اور باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کی بدولت تمام دنیا کی لذتوں کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو مطلق پروا نہیں کہ غریب رعایا پر کیا ظلم ہو رہا ہے۔ کس کس طرح اس کو ستایا جا رہا ہے اور ملک میں فقر و فاقہ نے نوع انسانی کے کثیر افراد کو کس حال تک پہنچا دیا ہے ــــ اگر لوگ انگریزوں کے پاس شکوہ و شکایت لے جاتے ہیں تو وہ اپنے کان بند کر لیتے ہیں۔ اور اگر نانا صاحب سے فریاد کرتے ہیں تو وہ کوڑوں سے خبر لیتے ہیں ــــ آخر کار یہ حالت اسی جگہ پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ اور انگریزوں نے علانیہ اپنی مخالفت کا اظہار کر کے تیغ و تفنگ کے ذریعہ سے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ حالت یہ تھی کہ اگر کوئی ذرا بھی سرتابی کرتا تھا فوراً تہ تیغ کر دیا جاتا تھا اور ایسے آدمیوں کو جن کی طرف سے ضعیف سا امکان بھی مخالفت کا تھا۔ چن چن کے قید و بند میں ڈالا جا رہا تھا

نانا صاحب کے قصر میں ایک بیس سال کی حسین نوجوان لڑکی تھی جسے نانا صاحب کے باپ نے پرورش کیا تھا۔ نانا صاحب بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا اس لڑکی نے ہر چند اسی قصر ظلم و استبداد میں پرورش پائی تھی۔ لیکن قدرت نے اسے عجیب طرح کا دردمند دل عطا کیا تھا اور وہ رعایا کی دردناک حالت دیکھ کر بہت کڑھا کرتی تھی۔ اگر کبھی وہ نانا صاحب سے اس کا ذکر کرتی اور اس کو لوگوں کی تباہ حالت کی طرف توجہ دلاتی تو وہ جواب دیا کرتا کہ :-

"میں زندگی کی جس راہ سے گذر رہا ہوں اس کا حال تجھے نہیں معلوم لیکن تو عنقریب دیکھے گی کہ نانا صاحب خائن نہیں ہے جیسا کہ لوگ اسے سمجھتے ہیں۔ اور نہ وہ انگریزوں کا کاسہ لیس بننا چاہتا ہے۔ جیسا کہ گمان

کیا جاتا ہے ۔۔۔۔ "

نانا صاحب ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوا تھا اور زمانے کا سرد و گرم کافی دیکھ چکا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ رعایا کا کیا حال ہے۔ وہ اچھی طرح واقف تھا کہ غریب ہندوستان اپنے سرمایہ دار مالک کے لئے کیونکر اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ اور اس نے عہد کیا تھا کہ اپنی قوم کو اس عذاب سے ضرور نجات دلائے گا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ غدر شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے ہندوستان کے تمام حصوں میں آگ مشتعل ہو گئی۔ نانا صاحب نے بھی اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنے خواب آزادی کی تعبیر ڈھونڈھنا چاہی۔ لیکن اس نے بجائے اعلان بغاوت کے خود اپنی ہی قوم کے لوگوں کو ستانا شروع کیا اور انگریزوں کی اعانت کی تاکہ وہ اور نہ پامال کریں ۔۔۔۔ اس میں نانا صاحب کا کیا راز مستور تھا؟ اس نے کیا تدبیر سوچی تھی؟ اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

(۲)

شہر کی سڑکوں پر آرائشی جھنڈیاں اُڑ رہی ہیں پھولوں سے دروازے آراستہ کئے جا رہے ہیں اور ایک بڑے میدان میں کسی جلسہ کا اہتمام ہو رہا ہے۔ ۔۔۔۔ کوئی بڑا انگریزی افسر آنے والا ہے۔ اور نانا صاحب کے حکم سے تمام مخلوق اس کی پذیرائی کے لئے میدان میں جمع ہو رہی ہے۔

وقت معینہ پر انگریز افسر آیا۔ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ نانا صاحب نے اس کا استقبال کیا اور بلند چبوترے پر اس کو بٹھا دیا۔ نانا صاحب داہنی طرف بیٹھا ہوا تھا اور وہ لڑکی بائیں جانب۔ فوج چاروں طرف احاطہ کئے ہوئے تھی

انگریز افسر کھڑا ہوا اور یوں مخاطب ہوا:۔

"حاضرین! ہم آج تمھاری سرزمین میں فاتحانہ داخل ہوئے ہیں اور جس جس نے سرکشی کی ہے اس کو پوری سزا دے چکے ہیں۔ لیکن آج میں یہاں تمھارے نانا صاحب کے بلاوے پر آیا ہوں جو ہمارا دوست و حلیف ہے اس لئے بتاؤ کہ تم صلح کے خواہشمند ہو یا جنگ کے ـــ تاکہ دوستانہ ہاتھ بڑھائیں اگر تم امن کے طالب ہو ـــ یا آگ اور خون برسائیں اگر جنگ چاہتے ہو۔"

یہ سننے کے بعد مجمع میں ہل چل پیدا ہو گئی اور چاروں طرف سے برہمی کے آثار نمودار ہونے لگے ـــ انگریز افسر نے یہ سمجھ کر کہ اس نے لوگوں کو ڈرانے میں غالباً احتیاط سے کام نہیں لیا، اپنی تقریر کا رُخ بدلنا چاہا، لیکن نانا صاحب فوراً کھڑا ہو گیا اور اس نے قوم کو مخاطب کر کے کہا:۔

"تم لوگ بزدل ہو، ذلیل ہو، بے غیرت ہو۔ افسوس ہے کہ غیروں کی حکومت کا جوا تمھاری گردن پر پڑا ہوا ہے اور تم اس لعنت کے طوق پر مطمئن معلوم ہوتے ہو۔ اگر کچھ بھی شرم کا احساس ہے تو اپنی آوازیں بلند کرو اور مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

لوگوں نے یہ سنا اور ایک آواز ہو کر جواب دیا ـــ "تو خائن ہے۔ تو نمک حرام ہے اور ہم تیرا ساتھ دینے کے لئے آمادہ نہیں۔"

مجمع کی حالت اب ایسی تھی کہ شاید وہ نانا صاحب پر حملہ کر کے فنا کر دیتا، لیکن عین اسی وقت ایک ضعیف العمر انسان اپنی لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے

دفعتاً کھڑا ہوا ——— یہ ایک نجومی تھا جس کا نام لوگوں کو معلوم تھا نہ وطن سے واقفیت تھی۔ یہ گاؤں گاؤں پھرا کرتا تھا اور عبادت و ریاضت روحانی کی تعلیم لوگوں کو دیا کرتا تھا۔ ناناصاحب کی ربیبہ (لڑکی) اس کی بڑی عزت کرتی تھی اور یہ بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

لڑکی نے انگریز افسر سے کہا: "اس بوڑھے کو کہنے دو جو کچھ کہنا چاہتا ہے"

افسر یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ اور بڈھے نجومی نے یوں خطاب کیا:-

"اے عزیزو! کامل پچاس سال ہوئے کہ میں صحراؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں پھر رہا ہوں۔ تم دیکھتے ہو کہ میری انگلیاں اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہیں جیسے کسی طائر کا سینہ تیروں سے چھلنی ہو جائے۔ ایک زمانہ مجھ پر اس حال میں گذر گیا کہ سیلاب میرے اوپر سے گذر رہے تھے اور میں اپنی بڑھی ہوئی تشنگی بجھانے کے لئے ایک قطرہ بھی اُن سے حاصل نہ کرتا تھا ——— سالہا سال میں نے اپنی زندگی کے اس طرح بسر کر دئے ہیں کہ تپتے ہوئے صحراؤں میں میرے عریاں جسم پر گرم آفتاب کی شعاعیں پڑ پڑ کر میرے عروق کے اندر خون کو خشک کرتی چلی جا رہی ہیں اور میں نے سایہ کی تلاش میں ایک برگ خشک کی بھی جستجو نہیں کی ——— پھر یہ بھی سن لو کہ کامل دس سال میں نے جنگلوں میں اس طرح صرف کر دئے ہیں کہ جب بہت بھوکا ہوتا تھا تو ان کی چھال چاٹ لیتا تھا اور جب بہت پیاس لگتی تھی تو رات کے آنسوؤں سے جنھیں تم شبنم کہتے ہو تسکین کر لیتا تھا درندوں نے مجھ سے وحشت ترک کر دی تھی اور چڑیاں میرے اُلجھے ہوئے

بالوں میں آکر بسیرا لیا کرتی تھیں ———— "

نانا صاحب ہاتھ میں کوڑا لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور ارادہ کیا کہ اسے خاموش کر دے لیکن انگریز افسر نے کہا کہ نہیں اس کو اپنی تقریر ختم کر لینے دو۔

بڈھے نجومی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"یاد رکھو کہ دنیا کی کوئی سختی مجھے نہیں ڈرا سکتی۔ کسی ضرب کا مجھ پر اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ میرا جسم تو پتھر ہو گیا ہے اور اس پر چوٹوں کا اتنا ہی اثر ہوگا جیسے پتھر کی چٹانوں سے ہوا گزر جائے ———— ہاں تو ایک طویل زمانہ میں نے ایسی فضا میں بسر کر دیا جس کی تاریکی نہایت شدید اور جس کا سکون حد درجہ خوفناک تھا۔ میں اس تاریکی میں گھرا ہوا تھا اس سیاہ چادر نے میری بصارت و بصیرت دونوں پر پردہ ڈال رکھا تھا کہ دفعتاً ایک دن یہ پردہ پھٹا اور ایک آسمانی کڑک نے مجھ کو بیدار کر کے کہا کہ اٹھ کھڑا ہو اور چل۔ معرکہ کا دن آ گیا ہے۔ چل اور اپنے راستے میں ان سرخ بیجوں کو بکھیرتا جا جو تیری مٹھی میں بند ہیں۔ چل۔ اپنی کرخت راگنیوں کو فضا میں بلند کر اور پکار پکار کر سب کو بلا اور کہہ کہ "آؤ ان خونیں کھیتوں کو کاٹیں۔ اے کاہل و نا عاقبت اندیش کسانو! دن طلوع ہو گیا ہے اور آفتاب اپنے خنجر لے کر بلند ہو چلا ہے۔ آؤ۔ چلو، بڑھو اور ان سرخ کھیتوں کو کاٹنا شروع کیا۔"

یہ کہہ کر اس نے انگریز افسران کی سُرخ پوش فوجوں کی طرف اشارہ کیا۔

نانا صاحب یہ سنتے ہی چیخ اٹھا "اے میرے دوست تو نے بالکل صحیح کہا۔ کھیتی

کاٹنے کا وقت آگیا ہے ـــــ ایک گھنٹہ نہ گذرا تھا کہ انگریزی افسر مع اپنی فوج کے قید خانہ میں پڑا ہوا تھا۔ اور جوق در جوق جماعتیں جنگ کے لئے آمادہ ہو کر چلی آرہی تھیں۔

(۴۳)

اس واقعہ سے تو تاریخ کے صفحات خالی ہیں۔ لیکن اس کے بعد کا حال سب کو معلوم ہے کہ کامل دو سال تک نانا صاحب نے انگریزوں سے جنگ کی اور جب وہ کانپور میں پوری بے رحمی کے ساتھ اس "سُرخ کھیتی" کو کاٹ چکا تو ۱۸۵۹ء میں اپنی اہلیہ اور احباب و اعوان کے ساتھ کسی طرف کو نکل گیا۔ انگریزوں نے یہ خبر مشہور کی کہ نانا صاحب مارا گیا اور عنقریب اس کا سر دہلی کے بازاروں میں گشت کرایا جائے گا۔ لیکن اس کی تکمیل کبھی نہیں ہوئی اور آج تک کسی کو نہیں معلوم کہ نانا صاحب کو آسمان کھا گیا یا زمین۔

حسن کی شہر آشوبیاں

شام کا وقت ہے ہلکی ہلکی تاریکی افق سے بڑھ رہی ہے۔ اور ان پرندوں کی طرح جن کو بسیرا لینے کے لئے دیر ہوگئی ہو، ماہی گیر اپنی اپنی کشتیوں کے بادبان جلدی جلدی لپیٹ رہے ہیں۔

ساحل اسکندریہ پر آخری کشتی آہستہ آہستہ پہنچی ہے۔ ایک آدمی سیاہ لبادہ میں لپٹا ہوا خاموشی سے اترتا ہے اور ایک عورت کو ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے نیچے اتارتا ہے —— ہم نے اس کو عورت کہا۔ حالانکہ اس کے چھریرے نازک جسم اور ہلکے ہلکے قدموں کو دیکھتے ہوئے اسے کمسن لڑکی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

سترہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اور وہ کونسی عورت ہے جسے اس عمر میں "لڑکی" سے زیادہ کسی اور لفظ سے منسوب کیا جا سکے۔ لیکن کلیوپیٹرا جو اس وقت کی نہایت شائستہ و ترقی یافتہ قوم کی فرد تھی اور جو ادب و انشا و فنون لطیفہ میں مہارت تامہ حاصل کر چکی تھی۔ اپنے دل و دماغ کے لحاظ سے اسی عمر میں "پوری عورت" ہو چکی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ٹولمی کی لڑکی کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ وہ ٹولمی جس نے اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں کے وقت بھی بانسری اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑی اور جس نے ملک کی ہر تباہی کا خیر مقدم تازہ جام شراب سے کیا —— ظاہر ہے کہ وہ

لڑکی جس کی پرورش ایسی عیش کوش فضا میں ہوئی ہو، جس کا ماحول صرف "شباب و شراب" کی بدمستیاں رہا ہو، وہ سترہ سال کی عمر میں کیا کچھ نہ ہو گئی ہوگی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کلیوپیٹرا کو اس کے بھائی نے جلاوطن کرکے تھیباڈ میں نظربند کر دیا تھا اور سیزر، اسکندریہ میں موجود تھا۔ یوں تو کلیوپیٹرا ہر وقت اسی ادھیڑبن میں لگی رہتی تھی، کہ کیونکر اپنے بھائی سے انتقام لے کر، مصر کے تخت و تاج پر قابض ہو۔ لیکن سیزر کی آمد سے اس کو اپنی کامیابی کی امیدیں زیادہ قوی ہو گئی تھیں اور اس لئے وہ اپنے ایک خاص شخص اپالوڈورس کی مدد سے خفیہ طور پر ساحل اسکندریہ تک پہنچ گئی تاکہ سیزر کی امداد سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت مصر پھر حاصل کر سکے۔

کلیوپیٹرا، ساحل اسکندریہ تک تو تمام مصائب برداشت کرنے کے بعد پہنچ گئی تھی۔ لیکن اب بڑا اہم سوال یہ تھا کہ سیزر تک کیونکر پہنچ سکے۔ کیونکہ مصری سپاہیوں، اور جاسوسوں سے اس وقت اسکندریہ کی ایک ایک گلی معمور تھی اور کلیوپیٹرا جانتی تھی کہ اگر ذرا بھی پتہ کسی کو چل گیا تو اس کی گرفتاری یقینی ہے۔

اپالوڈورس نے جو بہت ذہین تھا۔ آخرکار ایک تدبیر نکالی اور کلیوپیٹرا کے نازک لچکیلے جسم کو قالینوں میں لپیٹ کر اپنے قوی شانوں پر رکھا اور قصر سیزر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب اپالوڈورس، قصر کے دروازے پر پہنچا تو حاجبوں اور دربانوں نے اس کو روکا۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ شخص قالینوں کا تاجر ہے اور سیزر کے سامنے اپنا مال پیش کرنا چاہتا ہے تو کوئی تعرض نہ کیا گیا اور وہ آزادی کے ساتھ

اندر داخل ہوگیا۔

(۲)

ہرچند سیزر اب جوان نہ تھا اور زندگی میں ایک انسان کو جتنی مسرتیں اور لذتیں میسر آسکتی ہیں۔ ان سب سے وہ لطف اندوز ہوچکا تھا۔ لیکن احساس نشاط ہنوز اس میں باقی تھا۔ اور یہی وہ خصوصیت تھی جس پر اعتماد کر کے کلیوپیٹرا اس کے پاس آئی تھی۔

جس وقت اپالوڈورس نے کلیوپیٹرا کو قالینوں کے اندر سے نکالا تو اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی وحشی ہرن کو آزاد کر دیا جائے اور وہ تھوڑی دیر تک گھبرایا ہوا ادھر ادھر دیکھتا رہے۔ اس نے اپنے چھوٹے سے نقرئی آئینہ میں جو کمر کی طلائی زنجیروں میں لٹکا ہوا تھا اپنی صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ نہ آنکھوں میں سرمہ کی تحریر کا کہیں پتہ ہے نہ گالوں میں غازہ کی سرخی کا۔ لباس بھی حد درجہ بے ترتیب ہے۔ اور بال بھی الجھے ہوئے شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کا احساس حسن پھر قوی ہوگیا اور وہ اسی سادگی حسن و شباب کو لئے ہوئے سیزر سے ملنے اور اس کو مغلوب کرنے کے لئے آگے بڑھی۔

وہ آگے بڑھتی جاتی تھی اور سیزر اس کے لچیلے جسم کی جنبش اور اس کی دلکش سبک رفتاری کی نزاکت کو نہایت حریصانہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ قریب آئی تو سیزر نے اس کی ابروؤں کے خوبصورت خم کو دیکھا اس کی مست و مخمور آنکھوں سے نکلنے والے جادو کو دیکھا۔ اس نے باریک پنکھڑی کی طرح باریک نتھنوں کو دیکھا، اور ایک دوسرے سے جدا رہنے والے گداز لبوں کو دیکھا، اس کے جسم کے نرم کندن کو دیکھا اور ایک

ایسے جذبہ کے ساتھ جو اس وقت تک کبھی اس کے دل میں پیدا نہ ہوا تھا بے اختیار کہہ اٹھا کہ " اے قلوپطرا ۔ بول میں تیرے لئے کیا کر سکتا ہوں "

کلیوپیٹرا نے جو یونانی، شامی، مصری اور لاطینی زبانوں کی ماہر تھی سیزر کو اس کی ملکی زبان میں جواب دیتے ہوئے بھائی کے مظالم بیان کئے اور یہ التجا پیش کی کہ مصر کا تاج و تخت حاصل کرنے میں اس کی مدد کی جائے ۔

ظاہر ہے کہ سیزر جو ہمیشہ سے عورت کے حسن و شباب کا غلام رہا تھا، قلوپطرا کی کسی خواہش کو رد نہ کر سکتا تھا۔ اور وہ فوراً اس کے فرمان کی تعمیل کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے ۔ لیکن حالات اس قدر عجلت کے مقتضی نہ تھے کیونکہ وہ اسکندریہ صرف سیاحانہ طور پر آیا تھا۔ اور اس کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ وہ مصری سپاہ کا مقابلہ کر سکتا ۔

کلیوپیٹرا نے اس کو سمجھایا اور کہا کہ " اگر یہ پس و پیش کمی افواج کی وجہ سے ہے تو فی الحال میری حکومت کا صرف اعلان کر دیا جائے اور جب روم سے فوج آجائے تو میرے بھائی کو تخت سے اُتار کر میرے سپرد کر دیا جائے ۔"

اس طرف جب تولمی دوازدہم کو معلوم ہوا کہ اس کی بہن قید سے نکل کر سیزر کے پاس پہنچ گئی ہے تو اس نے اچیلس کی قیادت میں ایک زبردست فوج اسکندریہ کی طرف روانہ کی اور رومی سپاہ کے ایک دستے کو جو وہاں موجود تھا تہ تیغ کرا دیا ——— یہ تھی ابتدا اس جنگ کی جو کامل دو سال تک مصری و رومی 2
سپاہ کے درمیان جاری رہی اور جس نے ہزاروں انسانوں کا خون بہانے کے بعد اسکندریہ کے مشہور کتب خانے کو بھی جلا کر خاک سیاہ کر دیا ۔

سیزر تا نہ رومی افواج کے انتظار میں قصر بروشیم کے اندر محصور ہے اور کلیوپیٹرا بھی سرزمین مصر پر لڑائی کی آگ روشن کر کے سیزر کے ساتھ ہی قصر کے اندر مقیم ہے۔

بروشیم، اسکندریہ کا وہ مشہور محل تھا جس کی بنیاد سکندر اعظم نے ڈالی تھی اور جس میں اس کے جانشینوں نے برابر اضافہ کر کے اس کو ایک نہایت ہی مستحکم قلعہ اور نہایت ہی جمیل قصر کی صورت دیدی تھی۔ اس کے بڑے بڑے مرمری ایوان جو یونانی و مصری فن تعمیر کی نازک ترین صناعیوں کا نمونہ تھے، اس کے زرین در و دیوار، مطلا بام و سقف، صیقل شدہ آئینہ سے حوض، بلور کے ترشے ہوئے فوارے۔ وسیع قطعات چمن، یوں تو سیزر کے لئے ہمیشہ جاذب نظر تھے۔ لیکن یہ حقیقت کلیوپیٹرا کے آنے کے بعد ہی اس پر کھلی کہ ان تمام چیزوں میں کبھی کبھی جان بھی پڑ جایا کرتی ہے اور جس وقت ان مناظر میں یوں جان پڑ جاتی ہے تو پھر ایک انسان کے لئے تمام کائنات کو بھلا دینا کس قدر آسان ہو جاتا ہے۔

واقعی سیزر اس وقت تمام دنیا کو حرف غلط سمجھ رہا تھا اور کلیوپیٹرا کی معیت میں جو اسے مجسم "عطریت" نظر آتی تھی۔ ایک ایسی زندگی بسر کر رہا تھا جو اس سے قبل اس نے کبھی بسر نہیں کی تھی اور جسے وہ قدرت کا انتہائی انعام سمجھتا تھا۔

کامل چھ مہینے سیزر کو اس "خلوت کدۂ فردوس" میں زندگی بسر کرتے گزر گئے ہیں اور اسے مطلق ہوش نہیں کہ قصر بروشیم کے باہر کیا ہنگامہ برپا ہے۔ اور مصری افواج نے اس کے سپاہیوں کو کس قدر پریشان کر دیا ہے۔

ایک دن صبح کو تختۂ گلاب میں بیٹھا ہوا وہ کلیوپیٹرا کے بالوں کی عطریت کا

لطف اٹھا رہا تھا۔ کہ اس کو افواج روم کی آمد کی اطلاع ملی اور اس کا عسکری احساس دفعتاً بیدار ہو گیا۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور بولا کہ۔ اے کلیوپیٹرا، اب وقت آگیا ہے کہ میں تیرے احسانات کے اعتراف میں مصر کا تاج و تخت تیرے قدموں پر ڈال دوں۔ اس لئے مجھے اجازت دے کہ چند دن کے لئے تجھ سے جدا ہو کر پھر انھیں تلواروں کے سائے میں پناہ لوں، جو سیزر کو ملکۂ مصر کے التفات کا زیادہ اہل بنا سکتی ہیں۔

جس وقت روم کے سوار، گال کی پیادہ فوج۔ سلیشیا اور موڈس کے جہاز سامان رسد سے لدے ہوئے ساحل اسکندریہ پر پہنچے تو سیزر بھی جو چھ ماہ سے قلعہ بند تھا۔ باہر نکل آیا۔ اور جنگ میں مصروف ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ مصری فوج جو اچیلس کی سیادت میں برسرپیکار تھی بہت قوی تھی۔ لیکن روم کی منظم سپاہ اور سیزر کی کوہ شکن جرأت کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی۔ آخر کار اسے شکست ہوئی۔ کلیوپیٹرا کا بھائی مارا گیا اور سیزر نے اسکندریہ کی کنجیاں کلیوپیٹرا کے قدموں پر ڈال کر اس کو ایک بار ملکۂ مصر تسلیم کرا ہی دیا۔

یقیناً یہ وقت کلیوپیٹرا کی انتہائی مسرت کا وقت تھا اور اس کو وہ چیز حاصل ہو گئی تھی جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی۔ مگر وہ اس حقیقت سے بھی بیخبر نہ تھی کہ جس قوت سے یہ سلطنت حاصل کی گئی ہے اسی قوت سے قائم بھی رہ سکتی ہے اور اس لئے وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح سیزر کو ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لے۔

اُدھر چونکہ سیزر کی واپسی کے لئے روم نہ صرف یہ کہ بیتاب تھا بلکہ اس کی

طویل غیر حاضری سے برہم بھی ہو چلا تھا، اس لئے اس کو جلد سے جلد لوٹ جانا چاہئے تھا۔ کلیوپیٹرا نے بہت کوشش کی اور اپنے حسن و جمال کا ہر آزمودہ سحر اس نے آزما دیکھا لیکن چونکہ اس وقت سیزر میں جذبۂ وطنیت پھر ایکبار عود کر آیا تھا۔ اس لئے وہ کامیاب نہ ہوئی اور سیزر واپسی کی تیاریاں کرنے لگا۔

جب سیزر روانہ ہوا تو کلیوپیٹرا بھی اس کو جزیرۂ اسلیس تک پہنچانے کے لئے ساتھ ہو گئی اور کافی حصہ وقت کا لطف و نشاط میں بسر کرنے کے بعد جب جدائی کا وقت قریب آیا تو اس نے باچشم پرنم سیزر سے کہا کہ "کم از کم اتنا انتظار تو اور کرو کہ تمہاری امانت جو میں اپنے شکم کے اندر لئے ہوئے ہوں، وہ تمہاری آغوش میں سونپ سکوں۔"

یہ ایک ایسی خبر تھی جس نے سیزر کو پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کیونکہ اس کی تین بیویوں میں سے کسی کے اولاد نہ تھی۔ اور وہ اس کا متمنی تھا کہ دنیا میں اپنے بعد کوئی وارث دولت و حکومت کا چھوڑ جائے۔ چنانچہ وہ پھر ٹھہر گیا۔ اس کے تیرہ دن بعد جب سردارانِ روم، سیزر سے اس کی واپسی کے لئے الحاح و زاری کر کرتے تھک گئے تھے اور مایوس ہو کر واپس جانے لگے تو دفعتاً یہ خبر معلوم ہوئی کہ ولادت ہو گئی ہے اور ولادت بھی لڑکے کی۔ سیزر خوشی سے اچھل پڑا۔ اور کلیوپیٹرا کو ایک موقعہ مل گیا کہ وہ اس سے نکاح کر لینے پر اصرار کرے۔

سیزر خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے کلیوپیٹرا کو اپنے لئے مخصوص کر لے لیکن وہ مجبور تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی موجود تھی اور علاوہ اس کے قانون روما کی رو سے وہ کسی اجنبی عورت کو اپنے نکاح میں نہ لاسکتا تھا۔ کلیوپیٹرا اس سے کہا کرتی

کہ "قانون سیزر کے لئے نہیں ہے"؟ جو خود قانون بنانے اور توڑنے کے لئے پیدا ہوا ہو لیکن سیزر اس کو ٹال جاتا۔ اس بار بھی اس نے اس مسئلہ کو نظر انداز کرنا چاہا لیکن اس میں کامیاب نہ ہوا۔ اور دبی زبان سے وعدہ کرکے اپنے ملک کی طرف روانہ ہوگیا۔

(۱۴)

چونکہ سیزر کی غیر حاضری سے دشمنوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ اس لئے سلطنت روما اس وقت سخت خطرے میں مبتلا تھی۔ اور پمپائی کی فوجیں برابر بڑھتی آرہی تھیں۔ کلیوپیٹرا کی آغوش سے جدا ہوتے ہی سیزر کے فاتحانہ عزائم پھر عود کر آئے اور بجائے اپنے وطن واپس جانے کے وہ سیدھا ایشیائے کوچک کیطرف روانہ ہوا اور وہاں دشمن کے بیڑے کو تباہ کرکے اس نے کیدیس پر حملہ کیا۔ فرناسس کو شکست دی اور افریقہ پہنچکر تھاپسس کی مہم سر کی اور اس طرح بیشمار دولت، بے اندازہ مال غنیمت لے کر وہ روما واپس آیا۔ جہاں اس کی پذیرائی ایسے تزک واحتشام سے کی گئی کہ سرزمین روما نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا — — سیزر نے عوام کے لئے خزانہ کو وقفِ عام کردیا اور کامل چالیس دن تک جوشِ مسرت کی یہ کیفیت برپا رہی کہ لوگوں کو تن بدن کا ہوش باقی نہ رہا۔ جب جشن سے فراغت ہوئی تو دربار منعقد کیا گیا جہاں بانئ اعظم کا خطاب دیکر اسکی کرسی سب سے بلند مقام پر رکھی گئی اور معبد جیوپیٹر میں اس کا مجسمہ قائم کرکے اس پر دیوتا کا لفظ کندہ کیا گیا۔

اسکندریہ کی یہ حالت البتہ قابل اطمینان نہ تھی اور باوجودیکہ سیزر وہاں فوج چھوڑ آیا تھا کبھی کبھی بغاوت کے آثار پیدا ہوجاتے تھے اور لوگوں کی بےچینیاں

بڑھ رہی تھیں۔ کلیوپیٹرا پر عوام کی طرف سے یہ الزام قائم کیا جاتا تھا کہ وہ ایک اجنبی شخص کو مصر پر مسلط کرنا چاہتی ہے، جو ان کے ملکی، مذہبی اور قومی روایات کے بالکل خلاف تھا۔ اور چونکہ کلیوپیٹرا کا تسلط ابھی طرح قائم نہ ہوا تھا اس لئے وہ سازش کرنے والوں کو پکڑ کر قید و بند میں بھی نہ ڈال سکتی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ سیزر نے مہم افریقہ کے دوران میں ملکہ یونونیا سے تعلق پیدا کر لیا۔ اس خبر نے ایک طرف تو اہل مصر کو اور زیادہ جری بنا دیا کیونکہ اس سے انکو یقین ہو چلا کہ اب سیزر، کلیوپیٹرا کی حمایت نہ کرے گا اور دوسری طرف خود کلیوپیٹرا کو بہت اضطراب پیدا ہو گیا کہ کہیں سیزر ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

اس دوران میں سیزر اور کلیوپیٹرا کے درمیان باہم مراسلت قائم رہی، اور ہمیشہ سیزر اس کو اپنی محبت و وفاداری کا یقین دلاتا رہا، لیکن کلیوپیٹرا اس کو محسوس کرتی تھی کہ اگر یہ مفارقت چند دن اور اسی طرح قائم رہی تو اس کا اثر بالکل مٹ جائے گا۔ اور پھر مصر پر حکومت کرنا محال ہو جائے گا ـــــ اس نے کئی بار سیزر کو لکھا کہ وہ روم آنا چاہتی ہے۔ لیکن سیزر اس خیال سے کہ اہل روم اس کو کبھی پسند نہ کریں گے ہمیشہ ٹالتا رہا۔ آخر کار جب کلیوپیٹرا بالکل مجبور ہو گئی تو اسکے ذہین دماغ نے ایک تدبیر نکال ہی لی اور اس نے سیزر کو لکھا کہ جو دوستانہ معاہدہ اتحاد روما اور مصر کے درمیان ہوا ہے اور جس کے بعض شرائط معرض بحث میں ہیں انکو طے کرنے کے لئے وہ خود آنے والی ہے۔ حقیقتاً یہ ایک ایسا بہانہ تھا جس کے خلاف نہ سیزر کچھ کہہ سکتا تھا نہ اہل روما کو اعتراض کی گنجائش تھی۔ اس لئے سیزر نے اجازت دے دی اور کلیوپیٹرا روانہ ہو گئی۔

(۴)

جون کا مہینہ ہے اور رومہ کا موسم بہار اپنے شباب پر۔ دربار کی عظیم الشان عمارت کھچا کھچ آدمیوں سے بھری ہوئی ہے اور سڑکوں پر ہر جگہ لوگوں کا ہجوم تبادلۂ خیال میں مصروف نظر آتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کلیوپیٹرا دربار کی رقاصہ ہے۔ جو ہر وقت طلائی زیور اور موتیوں سے آراستہ رہتی ہے۔ بعض نہایت سنجیدگی سے یہ خیال قائم کئے ہوئے ہیں کہ وہ کوئی ساحرہ ہے۔ کاہنہ ہے، جو ہر شخص کو مسحور و مرعوب کر لیتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کی آغوش میں ہر وقت ایک ناگن کھیلتی رہتی ہے اور جسکو چاہے ڈسوا دیتی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا حسن بہت غیر معمولی ہے۔ اور بعض اس کو قبیح ترین شکل و صورت والی عورت سمجھتے ہیں۔ الغرض اہل رومہ، کلیوپیٹرا کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ اور چاروں طرف ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔

جلوس میں سب سے پہلے حبشی غلاموں کا ایک دستہ نظر آتا ہے۔ جن کے کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں جھول رہی ہیں۔ اس کے بعد خواجہ سراؤں کی ایک جماعت سامنے سے گذرتی ہے جو لمبی عبائیں پہنے ہوئے ہیں، پھر امراء و وزراء کی قطار نظر آتی ہے ان کے پیچھے کاہنوں اور نجومیوں کی جماعت گذرتی ہے۔ جنکی لمبی لمبی مخروطی شکل کی ٹوپیوں کو دیکھ کر اہل رومہ حیرت کر رہے ہیں اور پھر پجاریوں کا گروہ سامنے آتا ہے جو شیر کی کھال اپنے جسم پر لپیٹے ہوئے ہیں۔

جب یہ سب یکے بعد دیگرے گذر جاتے ہیں تو چمکیلے نیزوں اور سیاہ ڈھالوں کی جھرمٹ میں ملکۂ مصر کی زریں پالکی نظر آتی ہے۔ چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے اور ہر شخص کلیوپیٹرا کو دیکھنے لگتا ہے جو اپنی آغوش میں چھوٹے سیزر کو لئے ہوئے مسکرا رہی

ہے ـــــ اس کے سر پر ایک طلائی تاج تھا جس کی پشت سے ایک طلائی ناگن جھانک رہی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ کی تحریر اس کی آنکھوں کے سحر آگینی کو اور زیادہ نمایاں کر رہی تھی۔ غازہ کی سرخی سے اس کے چہرے کی ملاحت پر ایک خاص صندلی رنگ پیدا ہو رہا تھا اور لباس اتنا باریک تھا کہ اس کے سینہ و شانہ کا شباب نگاہوں میں کھبا جا رہا تھا۔

الغرض اس شان و اہتمام کے ساتھ کلیو پیٹرا۔ روما کی سڑکوں پر سے گذرتی ہوئی اس قصر تک پہنچی جو سیزر نے دریائے ٹیبر کے ساحل پر حال ہی میں تعمیر کرایا تھا۔

(۵)

کلیو پیٹرا کو روم آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ زمانہ گذر گیا ہے اور جشن و مسرت کی جتنی صورتیں ممکن ہیں سب اختیار کی جا رہی ہیں، پر تکلف دعوتیں ہیں، اور رقص و سرود کے جلسے۔ مردانہ کھیلوں کی نمائشیں ہیں اور علمی مجالس کے مظاہرے، لیکن باوجود اس کے کہ کلیو پیٹرا یہاں کے ذہین اور علمی طبقہ کو اپنی ذہانت و قابلیت سے مسخر کر چکی ہے، باوجود اس کے کہ سیزر کے شاہانہ اقتدار و جبروت کی حمایت حاصل ہے۔ وہ اس کو اچھی طرح محسوس کرتی ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی موجود ہے جو نہ صرف اُسے بلکہ سیزر کو بھی قہر و غضب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور معلوم نہیں کس وقت یہ آگ بھڑک کر چاروں طرف مشتعل ہو جائے۔

(۶)

جشن لیو پرکیلیا، پورے انہماک کے ساتھ منایا جا رہا ہے۔ سیزر، صدر کی حیثیت سے بیٹھا ہوا ہے اور کلیو پیٹرا اس کے پہلو میں طلائی کرسی پر متمکن ہے۔

جس وقت قربانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور میدان خون سے کافی رنگین نظر آنے لگتا ہے تو مارک انطانی جو سیزر کا سب سے زیادہ معتمد علیہ افسر ہے۔ زریں تاج لئے ہوئے اٹھتا ہے اور سیزر کے سر پر رکھ دینا چاہتا ہے۔ سیزر انکار کرتا ہے لیکن کلیوپیٹرا ـــ جو اصل محرک اس تجویز کی تھی پھر اصرار کرتی ہے اور جب انطانی دوبارہ تاج لے کر بڑھتا ہے تو سیزر پھر انکار کرتا ہے۔ کیونکہ سیزر جانتا تھا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے اور مخالفین اس سے فائدہ اٹھا کر ملک میں برہمی پیدا کر دیں گے ـــ بعض لوگوں نے سیزر کے اس طرز عمل کو دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور بعض جو اس کے مخالف تھے۔ انھوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں کہ یہ سب مکر و فریب ہے اور آج نہیں تو کل ضرور یہ اپنی ملوکیت کا اعلان کر دے گا۔

(۷)

صبح کا وقت ہے اور سیزر دارالامراء جانے کی تیاریاں کر رہا ہے کلیوپیٹرا کہتی ہے کہ آج اس قدر جلد جانے کی کیا ضرورت ہے لیکن وہ نہیں مانتا اور کام کی اہمیت کا ذکر کر کے کیسیس کے ساتھ ہو لیتا ہے جسے بروٹس نے بلانے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بروٹس اس کے دشمنوں میں سے ہے۔ وہ واقف تھا کہ مخالف جماعت کی سازشیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ لیکن اس نے اپنے اقبال و خوش بختی پر اعتماد کر کے کسی بات کی پرواہ نہیں کی اور دارالامراء کی طرف روانہ ہو گیا لیکن اس کا اندر داخل ہونا تھا کہ دفعتاً ایک شور پیدا ہوا اور پھر آناً فاناً شہر کے ایک ایک گوشہ میں یہ وحشت ناک خبر پھیل گئی کہ سیزر مار ڈالا گیا۔

ہیکل عشترو ت ذبح حسن و جمال

آہ، آہ، آہ............!

کاہن اعظم "آرام" اپنے حجرہ میں ساکت و مطمئن بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ اس کی بیٹی "زامورہ" کی آواز تھی۔

وہ گھبرا کر حجرے سے باہر نکلا اور دوڑتا ہوا "ہیکل عشترت" کے اس حصہ کی طرف گیا جہاں سے یہ آواز آ رہی ——— "زامورہ" ہیکل کے سامنے سربسجود رو رہی تھی اور اپنے ان ہاتھوں سے، جو دیوی "عشترت" کے مرمری قدموں کی طرح سفید و خوبصورت تھے۔ معبد کے زینوں کو چھو چھو کر بیتابانہ کراہ رہی تھی۔

"آرام" نے اپنی محبوب بیٹی کو اٹھایا اور اس کے سر کو چوم کر پوچھنا چاہا کہ یہ اضطراب کیوں ہے، لیکن اس کا گریہ بدستور جاری تھا۔ اور دیوی سے مخاطب ہو کر وہ برابر یہی کہتی جا رہی تھی کہ "اے محبت و انتقام کی دیوی۔ میں وہی کروں گی جو تیرا حکم ہے میں ہو تیرے فرماں سے انحراف نہ کروں گی"

"آرام" کچھ دیر تک اسی حال میں اس کو دیکھتا رہا اور پھر پوچھا کہ "اے بیٹی اس گریہ وزاری کا کیا سبب ہے؟"

زامورہ نے آنسو پونچھتے ہوئے ایک ایسے چہرے کے ساتھ جس کی شفاف

جلد سے خون اس طرح چھلک رہا تھا گویا کہ کسی ساغر بلور میں رنگ شہاب بھر دیا گیا ہے۔ جواب دیا :-

"اے میرے محترم باپ! تو نے مجھے اپنے بھتیجے "حارام" کے ساتھ نامزد کر دیا ہے اور تو چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اس کے آغوش میں سونپ دوں لیکن باور کر کہ جس وقت سے میں نے تیرا یہ فیصلہ سنا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے چین نہیں ملا اور حیران ہوں کہ کیونکر میں تیری مرضی پر چل سکوں گی جبکہ میرا دل اس کی طرف کسی طرح مائل ہی نہیں۔ پھر اے میرے مقدس باپ! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ صرف مجھی کو اس تعلق سے اختلاف نہیں بلکہ "دیوی عشتروت" بھی اس کو پسند نہیں کرتی جس کا تو خادم ہے"

وہ اس قدر کہہ کر خاموش ہو گئی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کا باپ یہ سن کر سخت برہم ہوگا۔ لیکن جب اس کا یہ خیال غلط نکلا اور کاہن اعظم اسی طرح شفقت و محبت کی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تو اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"تو معبد "عشتروت" کے خادم اور معابد "بیبلوس" میں سرزمین فنیقیا کے سب سے بڑے کاہن ہونے کی حیثیت سے واقف ہے کہ جب کوئی مصیبت انسان پر نازل ہو تو دیوی "عشتروت" سے مدد چاہنا ضروری ہے"

اُرام نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا :- "بیشک، "عشتروت" دیوی سے زیادہ صاحب الرائے کوئی دیوی نہیں" زاموره نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :-

"اے میرے محترم باپ، میں نے ہمیشہ تیری اس نصیحت پر عمل کیا اور اس

مرتبہ بھی جب کامل تین راتیں کرب و اضطراب میں بسر ہو گئی ہیں تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ دیوی ،عشتروت، سے فریاد کروں اور اس کے ارادہ و حکم کو معلوم کر کے اس پر کاربند ہوں ۔"

آرام نے کہا۔" اے میری بیٹی! سچ بتا۔کیا دیوی نے تیری فریاد کو سنا۔کیا اس نے کوئی جواب دیا ۔ ؟ "

زاموره بولی " ہاں سنا اور جواب دیا ـــ رات میں نے دیکھا کہ دیوی ،عشتروت، ایک ہالہ نور میں میرے سامنے نمودار ہوئی اور بولی کہ " اے زامورہ اپنی قوم میں سے تو کسی کو اپنا شوہر نہ بنا، کیونکہ تو یا تو سکندر مقدونی کی آغوش میں جائے گی یا پھر میرے ہیکل پر اپنی قربانی پیش کرے گی ۔"

یہ کہہ کر زامورہ خاموش ہو گئی اور اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ لیکن جب وہ خاموش رہا تو اس نے پھر اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ :۔

" اے باپ! تو نے سن لیا جو دیوی ،عشتروت، نے حکم دیا ہے ۔اور کیا اس کا یہ فرمان میرے لئے واجب العمل نہیں ؟"

کاہن اعظم نے اپنا سر اٹھایا اور بیٹی کی پیشانی کو بوسہ دے کر کہا کہ :ـــ

" بیشک واجب العمل ہے اور اس وقت سے تو صرف دیوی ،عشتروت، کی ملکیت ہے۔ تو معبد میں داخل ہو جا اور اس وقت تک باہر نہ نکل جب تک اسکندر مقدونی اس ہیکل کے اندر تجھے اپنی آغوش کی زینت نہ بنائے ۔"

زامورہ نے اپنے باپ کے ہاتھوں کو چوم کر کہا کہ :۔

" اے باپ، دیوی کے آخری فقرے، یعنی تو اسی ہیکل میں قیام کر

یہاں تک کہ فاتح اعظم آکر تجھے اپنی بیوی بنائے لیکن یہ یاد رکھ کہ اگر وہ اس سے قبل مرگیا اور تجھے اس کا مردہ دیکھنا پڑا تو اسی دن تجھ کو میرے ہیکل پر اپنی قربانی چڑھانا پڑے گی ۔"

(۲)

۳۲۴ سال قبل مسیح کا زمانہ ہے ۔

اسکندر مقدونی، دیار ہند سے ارض فارس کی طرف واپس آیا ہے ، نئے ملکوں اور نئی قوموں کو مفتوح و مغلوب کرنے کی مسرت میں دس ہیکل یونانی دیوتاؤں کے تیار کرا چکا ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ کم از کم ایک سال کے لئے اپنی فوجوں کو آرام دے تاکہ پھر وہ زیادہ جوش و قوت کے ساتھ کام کر سکیں ۔ خود بھی سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے گوشۂ امن و عافیت کا طلبگار ہے کہ دفعتاً بیمار پڑتا ہے اور بارہ دن کے اندر وہ حقیقی سکون اس کو نصیب ہو جاتا ہے جس کے بعد پھر کسی اضطراب سے واسطہ نہیں پڑتا ۔

فوجیں چاروں طرف احاطہ کئے ہوئے ہیں ، حکما و اطبا کا ہجوم ہے ، دعا اور دوا سبھی کچھ ہو رہا ہے لیکن اس کی حالت کسی طرح نہیں سنبھلتی ۔ ضعف بڑھ رہا ہے ۔ نبض ساقط ہو رہی ہے ۔ اور عین عالم شباب میں جبکہ اس کی عمر صرف ۳۳ سال کی تھی ۔ تیرہ سال کی حکمرانی و ملک گیری کے بعد دم توڑ رہا ہے ۔

آخری الفاظ وصیت اس کی زبان سے یہ نکلتے ہیں ۔

"میری لاش کو فینقیا میں ہیلوس کی طرف لے جایا جائے ۔ دریائے اڈونیس کے مقدس پانی سے اس کو غسل دیا جائے اور پھر دس

دن تک لوگوں کی زیارت کے لئے اس کو کھلا ہوا چھوڑ کر مصر لے جاکر جوارِ آمون میں دفن کر دیا جائے۔

(۳۲)

ارباب فن نے پورے دو سال تابوت، اور اس گاڑی کی تیاری میں صرف کر دیے جس کے ذریعہ سے سکندر کی لاش کو اس کے مدفن تک لے جانا تھا، اور ۳۲۳ء قبل مسیح میں براہ فینقیا بابل سے مصر کی طرف روانگی ہوئی۔

اس دن کی صبح جب سکندر کی لاش فینقیا پہنچنے والی تھی عجیب ہنگامہ کی صبح تھی، گوشہ گوشہ میں بہ آواز دُہل اعلان کیا جارہا تھا کہ دارا کو مغلوب کرنے والے اور دیار ہند کو فتح کرنے والے سکندر مقدونی کا جنازہ حدودِ فینقیا میں پہونچ گیا ہے اور ۶۴ بیل اس گاڑی کو کھینچ رہے ہیں جس پر اس کا تابوت رکھا ہوا ہے۔

لوگ، پہاڑوں سے، وادیوں سے، تمام قریہ و بلاد سے جوق در جوق چلے آرہے تھے اور اپنے ہاتھوں میں نہرِ اڈونیس کے مقدس پانی کے ظروف لئے ہوئے تھے۔ تاکہ اس کی لاش پر چھڑک کر ثواب حاصل کریں۔

جنازہ بلند دیواروں کے سایہ سے گذرتا ہوا کوہستانی راستہ سے اس مقام پر پہنچا۔ جہاں نہر مقدس کے پانی سے اس کو غسل دیا جانا تھا اور پھر وہاں سے ہیکل عشتردت میں لایا گیا۔ جہاں دس دن تک لوگوں کی زیارت کے لئے اس کو کھلا ہوا رکھنا تھا۔

مصر کا بادشاہ ملک بطلیموس ایک جرار فوج کے ساتھ استقبال کے لئے آیا تاکہ

لاش کو پورے احترام کے ساتھ مقبرے تک لے جائے۔ اور فنیقیا کے تمام کاہن اور امرا پرنم آنکھوں کے ساتھ مجتمع ہوئے تاکہ فاتح اعظم کی لاش کے سامنے اپنی محبت کے آخری آنسو پیش کر سکیں۔ اس طرح معابد تموز و عشتروت کی حسین کاہن زادیاں اپنے اپنے حجروں سے باہر نکل کر آ گئیں کہ دنیا کے اس جلیل القدر بادشاہ کی لاش کو دیکھ سکیں جس کے بازوؤں میں دیوتاؤں کی قوت موجود تھی۔ انھیں میں ایک زامورہ بھی تھی۔ جو ایک بیوہ کے پورے سوگ کے ساتھ آنسو بہاتی ہوئی تابوت کی زیارت کے لئے جا رہی تھی۔

(۴)

چونکہ زامورہ کے متعلق دیوی عشتروت کی بشارت کا علم ساری دنیا کو ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ ہر جگہ "محبوبۂ سکندر" کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔

زامورہ نے انتظار کا یہ زمانہ انتہائی خشوع و خضوع میں بسر کیا، وہ روزانہ صبح کو پہاڑ کی چوٹی پر جا کر پھول جمع کرتی تاکہ معبد تموز پر لا کر چڑھائے اور اس کے بعد سارا وقت ہیکل کے اندر بخور روشن کرنے اور التجا و دعا میں صرف کر دیتی وہ دیوی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتی اور اپنے بلور جیسے عریاں سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا کرتی کہ "اے دیوی وہ ساعت کب آئے گی جب سکندر مجھے آغوش میں لے گا"

دیوی ان التجاؤں کا کوئی جواب نہ دیتی۔ لیکن آخر کار ایک دن اس نے اپنا سنگین سکوت توڑا اور زامورہ سے کہا کہ۔ سکندر کی لاش سرزمین فراعنہ میں دفن ہونے کے لئے اس طرف سے گذرنے والی ہے۔ اس لئے جس دن تیری نگاہ

اس کی لاش پر پڑے گی، بس تجھ سے تیری قربانی چاہوں گی، کیا تو اس کے لئے تیار نہیں؟"

زامورہ نے منہ کے بل گر گر رتے ہوئے کہا کہ "اے دیوی! میں تیار ہوں کیونکہ جب سکندر کی آغوش میسّر نہ آئے تو پھر تیرے سنگین پہلو سے زیادہ راحت اور کہاں مل سکتی ہے"

(۵)

کاہن اعظم نے زامورہ سے کہا "اے بیٹی، کیا واقعی دیوی عشتروت کی یہی مرضی ہے۔ تجھے دھوکا تو نہیں ہوا۔"

زامورہ نے جواب دیا "اے باپ، مجھے دھوکا بالکل نہیں ہوا۔ میں نے اس کا یہ فرمان صاف اور صریح الفاظ میں سنا ہے۔ میں آج سکندر کی لاش دیکھ چکی ہوں۔ اس لئے دیوی کے حکم کی تعمیل ہونی چاہئے۔ کیا کاہن عشتروت ہونے کی حیثیت سے تجھے اس میں پس و پیش کرنا چاہئے۔"

زامورہ نے یہ کہا اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر قربان گاہ عشتروت پر لیجا کر اس طلائی خنجر کی طرف اشارہ کیا جو اسی رسم ذبح و قتل ادا کرنے کے لئے مخصوص تھا

کاہن مضطرب تھا، اس کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ حیران تھا کہ اپنی جمیل نوجوان بیٹی کے گرم خون کو کیونکر اپنی نگاہوں کے سامنے بہتا ہوا دیکھے گا ——

زامورہ نے خنجر اٹھایا اور اس کا قبضہ باپ کی طرف کر کے کہا کہ "اے باپ جلدی کر، مبادا دیوی خفا ہو جائے۔"

معبد کے تمام کاہن اور کاہن زادیاں جمع ہیں اور ایک آواز سے عبادت

کے گیت گا گا کر اس التجا میں مصروف ہیں کہ "اے محبت کی دیوی اس طاہر و مقدس قربانی کو قبول کر کے ملک کے کھیتوں کو ہرا بھرا کر دے۔ جہازوں کے لئے موافق ہوائیں چلا، تاجروں کے تھیلے لولو و مرجان سے بھر دے۔ لڑکیوں کے لئے اچھے شوہر اور لڑکوں کے لئے اچھی بیویاں فراہم کر، ملک کو امن و سکون سے آشنا کر اور دشمنوں کو تباہ و برباد ـــ"

یہ شور و ہنگامہ، ہنوز برپا تھا کہ کاہن اعظم "آرام" کا داہنا ہاتھ بلند ہوا اور ہر چند حاضرین نے خنجر کی تڑپ کو دیکھا۔ لیکن اس چیخ کو نہ سنا جو بے اختیارانہ زاموره کے منھ سے نکل گئی تھی۔ اس کا سینہ شق تھا اور خنجر کی نوک اس دل سے پار ہو چکی تھی جو اتنے دنوں سے اس پھانس کے لئے تڑپ رہا تھا۔

تشنۂ کوثر

خمارویہ بن احمد طولون سخت پریشان ہے اور حکم دیتا ہے کہ ابن یعقوب کو طلب کیا جائے۔ ابن یعقوب قبطی طبیب ہے۔ اور اپنے علم و حذاقت کے لحاظ سے خاص شہرت کا مالک ہے۔

ابن یعقوب حاضر ہوتا ہے اور خمارویہ اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :۔

"اے ابن یعقوب، میں بہت درماندہ و مضطرب ہوں اور اب اپنی تمام امیدوں کا مرکز تجھ کو قرار دے کر، تیری مدد چاہتا ہوں۔ تجھے معلوم ہے کہ میں کوثر سے کتنی محبت کرتا ہوں اور اس کی بیماری نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ پھر تیری حذاقت کس دن کام آئے گی اور سوا تیرے اس ملک میں کون ہے جو اس کے مرض کا علاج کر سکے۔

کوثر تیری ہی طرح نصرانی مذہب رکھتی تھی، لیکن جب اس کا باپ اسلام لایا تو وہ بھی مسلمان ہوئی اور میرے حبالۂ عقد میں آئی۔ اب میں اس کی بیماری کی وجہ سے سخت پریشان ہوں اور اگر کوئی شخص اس کو صحیح و تندرست کر سکے تو میں بڑی سے بڑی دولت پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔" 2

یہ سن کر ابن یعقوب نے کہا۔ "جو کچھ میرے امکان میں ہے اس سے دریغ نہ کروں گا۔ اور اپنی ساری کوششیں اس کی صحت یابی کے لئے صرف کر دوں گا۔"

(۲)

خمارویہ، اپنے باپ ابن طولون کی وفات پر ۲۷۰ھ میں مصر کے تخت پر بیٹھا اور اپنے باپ کی طرح نہایت اچھا حکمران ثابت ہوا — اس نے تمام امور مملکت پر خاص توجہ صرف کی۔ حدود سلطنت وسیع کئے اور اقطار اسلامیہ میں طولونی حکومت کا آوازہ بلند کر دیا — مصر کے اندر کثرت سے مساجد و محلات تعمیر کئے۔ رعایا کی راحت و آسائش کا خاص خیال رکھا اور شاہانہ جاہ و جلال میں بھی بہت کچھ اضافہ کیا۔ خمارویہ ایک جری سپاہی۔ ایک صاحب جبروت سردار ایک قدر شناس فرمانروا تھا اور وہ بلا لحاظ ملت و مذہب فضل و کمال کی عزت کرنے والا تھا۔

ایک دن اسکو معلوم ہوا کہ فوج میں ایک سپاہی ہے جو ابن طولون کے زمانے میں اسلام لایا تھا اور ایک لڑکی رکھتا ہے جو حسن و جمال اور بلندی سیرت کے لحاظ سے مصر بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ چنانچہ اس نے سپاہی کو طلب کیا اور پیام دے کر اس کی لڑکی کوثر سے نکاح کر لیا۔

جب کوثر محل شاہی میں داخل ہوئی اور خمارویہ نے اس کے حسن و جمال کو قریب سے دیکھا تو اس کا شیفتہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ قصر شاہی، مصر و شام، سرکیشیا و ترکستان کی نہایت حسین و جمیل عورتوں سے بھرا ہوا تھا، اور خمارویہ کبھی کبھی انکی طرف بھی ملتفت ہو جاتا تھا۔ اس لئے کوثر اپنے محبوب شوہر کے اس طرز عمل سے کڑھتی رہتی تھی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ گھلنے لگی اور دماغ پر بھی ایسا سخت اثر ہوا۔ کہ ایک دن سب نے جان لیا کہ وہ دیوانی ہو گئی ہے۔

(۳)

خمارویہ اور ابن یعقوب طبیب کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس کو کچھ زمانہ ہو گیا ہے اور خمارویہ اپنی محبوب بیوی کے پاس سے ایک لمحے کے لئے جدا نہیں ہوتا

ایک دن ابن یعقوب آیا اور بولا کہ "ملکہ کے علاج کے لئے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ اگر بادشاہ ایک شفاخانہ خصوصیت کے ساتھ ملکہ کے علاج کے لئے قائم کرنے پر راضی ہو تو ممکن ہے ملکہ شفایاب ہو جائے۔"

یہ سنتے ہی خمارویہ نے پایہ تخت میں نہایت وسیع پیمانے پر ایک عمارت اس غرض کے لئے تیار[1] کرائی۔ کوثر اس شفاخانہ میں داخل کی گئی اور وہاں سے شفا پا کر قصر میں واپس آئی۔

ظاہر ہے کہ خمارویہ کی محبت کا کیا عالم ہوگا۔ اس نے سوائے کوثر کے تمام عورتوں سے بات کرنا ترک کر دی اور دونوں محبت کی فردوسی زندگی بسر کرنے لگے

بظاہر یہ نہایت معمولی واقعہ تھا، لیکن اندر ہی اندر نہایت ہولناک مستقبل تیار کر رہا تھا کیونکہ محل کی وہ تمام عورتیں جو خمارویہ کی نگاہ سے اتر گئی تھیں، کوثر اور خمارویہ دونوں سے جلنے لگیں اور انھوں نے در پردہ امراء و افسران فوج سے مل کر ان کی ہلاکت و تباہی کی سازشیں شروع کر دیں۔

(۴)

رجب ۲۷۹ھ کی انیسویں تاریخ ہے، عباسی خلیفہ المعتضد باللہ تخت نشین ہوتا ہے اور لوگوں سے اس کی خلافت پر بیعت لی جا رہی ہے — خمارویہ بھی اپنی

---

[1] یہ مورخین کی غلطی ہے کہ اس شفاخانہ کی تعمیر کو احمد بن طولون کی طرف منسوب کرتے ہیں

طرف سے کچھ قیمتی ہدایا خلیفہ کی خدمت میں بھیجنا چاہتا ہے اور اپنے ایک مخلص دوست حسین بن عبداللہ کو (جو ابن الجصاص کی کنیت سے مشہور تھا۔) اس خدمت کے لئے منتخب کرتا ہے۔

ابن الجصاص نہایت ہوشیار شخص تھا۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ کیونکر اس خدمت سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ خمارویہ کی لڑکی — "قطر الندیٰ" بے انتہا حسین و جمیل ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ خلیفہ کے پاس پہنچ کر اس کا ذکر کرے گا تاکہ وہ اپنے بیٹے علی سے اس کی شادی کر کے طولونی فتنہ سے ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو جائے۔

چند دن کے بعد ابن الجصاص ہدایا لے کر روانہ ہوا۔ اور منزلیں طے کر کے خلیفہ معتضد عباسی کے حضور میں پہنچ گیا — خلیفہ نے نہایت مسرت سے ان قیمتی ہدایا کو قبول کیا اور ابن الجصاص سے گفتگو کرنے کے لئے تخلیہ کر دیا گیا۔

ابن الجصاص نے مصر کا حال بیان کرتے ہوئے خمارویہ کی لڑکی "قطر الندیٰ" کے حسن و جمال کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ "اگر ولیعہد خلافت (علی) کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے تو بہت مناسب ہے"۔ خلیفہ نے کہا "میں نے اور لوگوں سے بھی اس لڑکی کے حسن و جمال کا ذکر سنا ہے اور میں خمارویہ سے خود اپنے لئے اس کی خواہش کروں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے دس ہزار دینار ابن الجصاص کو دئے۔ اور حکم دیا کہ جلد سے جلد مصر جا کر خمارویہ تک یہ پیام پہونچا دیا جائے۔

(۵)

ایک سال گذرا اور دوسرا بھی۔

محرم ۲۸۲ھ میں ایک شاندار جلوس بغداد کی گلیوں میں داخل ہوتا ہے۔
اس کے وسط میں خمارویہ کی لڑکی "قطرالندی" زریں محمل پر سوار نظر آتی ہے
اور ابن الخصاص آگے آگے ہے۔

قطرالندی، خلیفۂ عباسی کے محل میں داخل ہو جاتی ہے اور ابن الخصاص
بیش قیمت ہدایا کے ساتھ مصر واپس کیا جاتا ہے۔

(۶)

"قطرالندی" کی روانگی کے بعد خمارویہ نے ارادہ کیا کہ تبدیل آب و ہوا
کے لئے قصر حکومت کو چھوڑ کر چند دن کے لئے دمشق چلا جائے۔ چنانچہ اس نے
حکم دیا کہ حرم کی تمام عورتیں کوثر کی جلو میں ساتھ ساتھ چلیں ۔۔۔ خمارویہ نے
ایک شیر پال رکھا تھا جو اس کے ساتھ ہر وقت قصر میں رہا کرتا تھا۔ یہ کبود
آنکھوں والا شیر بہت خوبصورت تھا۔ اور اپنے مالک سے حد درجہ مانوس تھا
خمارویہ کا اعتقاد تھا کہ جب تک یہ شیر میرے پاس ہے کوئی دشمن مجھ کو گزند
نہیں پہنچا سکتا۔

روانگی سے قبل اس کی ایک حرم نے جو کوثر کی شدید دشمن تھی۔ خمارویہ
سے کہا۔

۔اے آقا! لوگ کہتے ہیں کہ آپ بزدل ہیں اور اس واسطے اپنی حفاظت کے
لئے ہر وقت شیر کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ مجھ سے لوگوں نے بیان کیا تو میں نے

کہاکہ یہ خیال ہے اور دیکھ لینا اب کے سفر میں شیر ساتھ نہ جائے گا۔"

خمارویہ نے جواب دیا کہ "تم نے خوب جواب دیا۔ بے شک میں شیر کو ساتھ نہ لے جاؤں گا تاکہ لوگ مجھے بزدل نہ سمجھیں "

چنانچہ وہ شیر کو وہیں مصر میں چھوڑ کر دمشق روانہ ہوگیا۔

(۷)

دمشق پہنچنے کے بعد محل کی عورتوں کو اپنی سازش کی تکمیل کا کافی موقعہ مل گیا اور بعض افسرانِ فوج اور خادموں کی مدد سے اس کو ذبح کرا دیا۔ یہ واقعہ ذیقعدہ ۲۸۲ھ کا ہے۔ یعنی اسی مہینہ کا جب اس کی لڑکی قطرالندی کے ساتھ خلیفہ المعتضد باللہ نے شادی کی تھی۔

۳ ذی الحجہ کو خلیفہ تک اس واقعہ کی خبر پہنچی اور اس نے بیس آدمیوں کو جو اس جرم میں شریک تھے تہ تیغ کرا دیا۔ انھیں میں ایک شخص ابوالجیش بھی تھا اس سے فارغ ہونے کے بعد خلیفہ نے ابن الخصاص کو خط بھیجا اور اسے مصر طلب کیا۔

قطرالندی کو جب اپنے باپ کے قتل کئے جانے کا حال معلوم ہوا تو بہت روئی اور التجا کی کہ کوثر کو یہاں بلا لیا جائے کیونکہ وہ اس کے باپ کی بہت محبوب بیوی تھی۔

خلیفہ نے پوچھا کہ "تم یہ کیوں چاہتی ہو" قطرالندی نے جواب دیا کہ مصر میں تنہا وہی ایک عورت ایسی تھی جس کو مجھ سے بہت محبت تھی اور جب میری ماں کا انتقال ہوا تو اس نے اپنے بچوں کی طرح مجھے رکھا اور نہایت شفقت سے

پیش آئی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر وہ وہاں چھوڑ دی گئی تو لوگ اس کو بہت پریشان کریں گے بلکہ ہلاک کر ڈالیں گے۔"

خلیفہ نے ابن الخصاص کو دمشق بھیجا تاکہ کوثر کو اپنے ساتھ لے آئے۔ لیکن یہاں پہنچکر اس نے ایک عجیب رنگ دیکھا۔ محل کے اندر عجیب ہنگامہ برپا تھا اور کوثر غائب تھی۔ ایک بڑھیا سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ خمارویہ کے قتل کے بعد ہی چلی گئی تھی۔ اور دمشق کے ایک لکڑہارے کے مکان میں اس نے پناہ لی تھی۔"

ابن الخصاص اس کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ کوثر بے شک وہاں آکر ٹھہری تھی لیکن تین دن ہوئے کہ دفعتاً غائب ہوگئی۔

ابن الخصاص نے خیال کیا کہ اگر وہ کوثر کو لے کر بغداد نہ گیا تو ممکن ہے خلیفہ اس کو بھی سازش میں شریک سمجھے۔ اس لئے اس نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا اور آخر کار چوتھے دن دیکھا گیا کہ دریا میں ایک عورت کی لاش خس و خاشاک میں الجھی ہوئی پڑی ہے۔ وہ عورت کوثر تھی۔

انطانی اور کاہنۂ مصر

روم کی ہزیمت خوردہ فوجیں ساحل فنیقیا تک واپس آگئی ہیں اور بحر ابیض کے سفید ریتیلے ساحل پر خیمہ ڈالے پڑی ہوئی ہیں۔ اہل لشکر اپنی گذشتہ شکست و ناکامی کی وجہ سے ملول ہیں اور مستقبل کے متعلق فکرمند۔

ان کا سردار انطانی، لشکر کے ہنگامہ اور سپاہ کے شور و غوغا سے گھبرا کر اپنے رفیق ہتیو مصری کے ساتھ قریب کی اس پہاڑی کی طرف جا رہا ہے۔ جس کی بلندی اس سے قبل خدا جانے کتنی شکست خوردہ فوجوں اور کتنے فاتح لشکروں کو اپنے دامن سے گذرتی ہوئی دیکھ چکی ہے۔ اس پہاڑی کے ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف وہ دریا جو آج "دریائے کلب" کے نام سے مشہور ہے لیکن اس کو دلیقوس کہتے تھے۔

اب سے چند ماہ قبل انطانی اپنی فوجیں لے کر اسی پہاڑی کے نیچے سے گذرا تھا تاکہ وسط ایشیا پر حملہ کر کے وہاں کے ممالک کو اپنا اور اپنی حلیف کلیوپیٹرا ملکۂ مصر کا مطیع بنائے۔ لیکن آرمینا، فارس اور ما بین النہرین نے ایسی پامردی سے مقابلہ کیا کہ انطانی شکست کھا کر پھر بحر ابیض تک واپس آگیا اور یہاں مصری فوجوں کی کمک کا انتظار کرنے لگا۔ انطانی کی ہزیمت و ناکامی کا کچھ اندازہ اس سے

ہو سکتا ہے کہ جب وہ اس مہم پر روانہ ہوا تو پچاس ہزار سے زیادہ سپاہ اسکے ساتھ تھی اور جب واپس آیا تو صرف دس ہزار رہ گئی تھی اور اب بھوک پیاس کی حالت میں بحر ابیض کے ساحل پر پڑی کراہ رہی تھی۔

انطاؔنی پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور جب تھک جاتا تو کسی چٹان پر بیٹھ جاتا اور دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی کو رکھ کر دور سمندر کی طرف دیکھنے لگتا کہ شاید افق بعید میں مصری جہازوں کے بادبان نظر آجائیں۔ کبھی اس کی نگاہیں دھوکا بھی دے جاتیں اور جن چیزوں کو وہ بادبان سمجھتا وہ صرف سمندر کی چڑیوں کا جھنڈ ثابت ہوتیں۔

انطاؔنی اسی فکر و تردد کے عالم میں ایک چٹان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک کوّے کی آواز سے چونک پڑا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے رفیق کو ڈھونڈھا جو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، لیکن اس وقت وہ چند قدم دور آگے کھڑا ہوا سامنے کی ایک چٹان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

انطاؔنی اٹھا اور اس کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا اور وہ بھی ان نقوش کو غور سے دیکھنے لگا جو چٹان پر نظر آتے تھے۔

یہاں اس وادی میں، اس دریا کے کنارے، اس وسیع و بسیط سمندر کے سامنے اور انھیں مہیب چٹانوں کے پاس سے خدا جانے کتنے لشکر انطاؔنی سے پہلے گذر چکے تھے۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کتنے فاتحانہ انداز سے سربلند گذرے اور کتنے شکست خوردہ سرنگوں۔ وہ بڑے بڑے زلزلہ افگن سردار۔ وہ بڑے بڑے جسم پر رعشہ طاری کر دینے والے سپہ سالار۔ جنھوں نے

ساری دنیا میں اپنی جرأت و بہادری کا سکہ قائم کر رکھا تھا۔ آج ابدیت کے بحر ذخار میں ڈوب کر فنا ہو چکے ہیں اور ان کی نشانیوں میں سے اب سوائے برباد شدہ زمینوں، تباہ و ویران بستیوں اور سنسان خرابوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ان چٹانوں پر انھیں فاتحین عالم کے نام منقوش تھے۔ اور جس چٹان کے پاس انطانی اور اس کا رفیق کھڑا ہوا تھا۔ اس پر رمیسس ثانی فرعون مصر کا نام کندہ تھا۔ انطانی نے اپنا سر اظہار احترام میں جھکایا اور بولا کہ "کسے خبر ہے کہ میری یادگار ان چٹانوں پر کیا ہوگی۔ ایک فاتح سپہ سالار کی سی یا ہزیمت خوردہ نکبت زدہ انسان کی سی۔" وہ یہ کہتا ہوا دوسری چٹان کی طرف بڑھا اور پھر تیسری چٹان کی جانب۔ ان پر سلمانصر اور سنجاریب (شاہان اشوریا) کے نام منقوش تھے۔ جو سات صدی پیشتر ادھر سے گذرے تھے۔ ان کا نام دیکھ کر انطانی ماضی کی تاریخ میں غرق ہو گیا۔ اور اسی کے ساتھ خود اپنی زندگی کے تمام ایام ایک ایک کر کے اُسے یاد آنے لگے۔ سب سے پہلا وہ دن جب مصر کی نوجوان ساحر ملکہ (کلیوپٹرا) سے اس کی نگاہیں دوچار ہوئی تھیں۔ پھر وہ دن جب محبت کا اولین شعلہ اس کے سینہ میں بھڑکا۔ اس کے بعد وہ دن جب اس نے اسکندریہ میں کلیوپٹرا کے ملکۂ مصر و قبرص اور فرمانروائے افریقہ و سوریا ہونے کا اعلان کیا اور سب سے آخر میں وہ دن جب سلطنت روما نے اس کو ملت فروش اور غدار وطن قرار دے کر اس کے استیصال کا فیصلہ کیا۔ وہ انھیں خیالات میں محو تھا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ اس نے گردن اُٹھا کر دیکھا کہ ایک بڑھیا عورت لکڑی کے سہارے سے آہستہ آہستہ اُوپر کی طرف

چڑھتی آرہی ہے۔ جب وہ انطاکی کے قریب پہنچی تو ٹھہر گئی اور تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد دفعتاً ایک قہقہہ لگایا اور بولی :-

"اے انطاکی، تو اس ویران دہشتناک مقام پر کیوں آیا ہے۔ کیا روما کو تباہ کرنے اور شرق و غرب میں جنگ کی تباہیاں پھیلانے کے بعد یہاں اسلئے آیا ہے کہ سانپوں کو ان کی بانبیوں سے نکال کر پریشان کرے۔ گدھوں کے گھونسلوں میں آگ لگا کر انھیں آشیاں برباد کرے۔ بھیڑیوں اور لومڑیوں کے بھٹ کھود کر اُن کو آزار پہنچائے۔ کیا دنیا میں اب کوئی انسان تیرے ظلم کا نشانہ بننے کے لئے باقی نہیں رہا"

انطاکی حیران تھا کہ یہ کون عورت ہے جو اس طرح بیباکانہ گفتگو کر رہی ہے۔ اس نے اپنے رفیق کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"اے ہتیو، یہ بڑھیا کون ہے؟ کیا تم پہچانتے ہو؟"

"نہیں! میں اس سے بالکل ناواقف ہوں"

یہ سن کر بڑھیا غصہ سے لال ہوگئی اور چیخ کر بولی کہ "اے کمینے، اے منافق! ادھر دیکھ میری آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہہ تو مجھے نہیں پہچانتا۔ اے ذلیل کتے! کیا میں وہ دن بھول سکتی ہوں جب تو نے میرے اکلوتے بیٹے کو اس سردار سے قتل کرا کے میری دنیا کو ویران کر دیا"

یہ سن کر انطاکی کی حیرانی کی انتہا نہ رہی اس نے پوچھا۔

"اے بڑھیا تو کون ہے۔ تیرا بیٹا کون تھا اور تو میرے رفیق پر کیوں یہ الزام قائم کرتی ہے"

بڑھیا نے کہنا شروع کیا۔ "اے انطانی! مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ کیونکہ تجھے دھوکا دیا گیا تھا۔ میں اس مکار سے مخاطب ہوں جسے تو اپنا رفیق کہتا ہے۔ ادھر میرے پاس آ اور اپنے رفیق کے کمینہ پن کی داستان تو بھی سن لے۔ میں ایک کاہنہ ہوں اور مسلسل چالیس سال سے ہیکلوں اور معبدوں میں گھوم پھر کر زندگی بسر کر رہی ہوں۔ مصر و فینقیا کا کوئی مقام ایسا نہیں جہاں کے لوگ مجھے نہ جانتے ہوں اور میری پیشین گوئیوں کو غلط باور کرتے ہوں۔ میرا ایک بیٹا تھا۔ اکلوتا بیٹا جسے میں اپنے علم کے اسرار سکھا رہی تھی وہ تمام راز جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں اس کو بتا رہی تھی۔ ناگہاں اس کی نگاہ ایک نوجوان لڑکی پر پڑی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا۔ یہ لڑکی بھی اس سے مالوف ہو گئی، اور دونوں میں نکاح کا عہد و پیمان ہو گیا۔ یہ دونوں لطف و مسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک اور شخص اس لڑکی کا نہیں بلکہ اس کی دولت کا خواہاں پیدا ہو گیا اور میرے بیٹے کی ہلاکت کا سبب بنا۔ وہ شخص یہی تیرا رفیق ہے، جو میرے سامنے اور تیرے پہلو میں کھڑا ہوا ہے۔"

انطانی نے ہتیو کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیا یہ صحیح ہے؟" لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بڑھیا نے کہا "اے انطانی کیا اس کا یہ سکوت اس امر کا ثبوت نہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ بالکل صحیح ہے اور اس میں تردید کا حوصلہ نہیں۔"

انطانی نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "اس کے بعد یہ ہوا کہ اسکندریہ میں تیرے پاس پہنچا،

اور مخبری کی کہ مصریوں کی ایک جماعت تیرے خلاف سازش کر رہی ہے۔"

انطاقی بولا۔ "یہ صحیح ہے لیکن وہ سازش کرنے والے میرے ہاتھ نہیں آئے۔"

بڑھیا نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ہاتھ کیا آتے جبکہ حقیقت کچھ نہ تھی اور یہ دغاباز صرف اس لئے جھوٹ بول رہا تھا کہ میرے بیٹے کو تیرے ہاتھ سے ہلاک کرا کے اس لڑکی کو حاصل کرے۔ پھر کیا تجھے یاد نہیں کہ اسی سازش کے الزام اور ملکہ سے محبت کرنے کے جرم میں تو نے میرے جوان بیٹے کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا اعلان کر رکھا تھا۔ لیکن کوئی سننے والا نہ تھا۔ وہ آسمان و زمین کو گواہ بنا کر کہہ رہا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لیکن اس کی بات کا یقین کرنے والا کون تھا۔ یہ مکار، منافق تجھے ابھار رہا تھا۔ یہ کہہ کہہ کر کہ وہ سازش میں شریک ہے تیرے دل میں ہیجان پیدا کر رہا تھا یہ یقین دلا کر کہ وہ ملکہ سے محبت کرتا ہے اور ملکہ اس سے۔ درانحالیکہ میرے بیٹے نے سوائے اس ایک لڑکی کے کسی اور سے محبت کی ہی نہیں۔ اور آخر کار اسی کی محبت میں اس نے جان دی۔

پھر جس وقت تو نے قتل کا حکم دیا میں وہیں تھی۔ جس وقت جلاد کی تلوار نے میرے بیگناہ بیٹے کے سر کو تن سے جدا کیا میں وہیں موجود تھی۔ کیا تو سمجھ سکتا ہے کہ مجھ پر اس وقت کیا گذر رہی تھی تو کیا سمجھ سکتا ہے۔ تیرا بیٹا اگر کبھی تیرے سامنے اس طرح ذبح کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ اولاد کی محبت کیا چیز ہے اور دنیا میں ان ماں باپ کے غم سے زیادہ زہر آلود غم کسی کا نہیں جن کے اکلوتے بیٹے نے ان کے سامنے دم توڑا ہو۔

اس واقعہ کے بعد میں یہاں چلی آئی اور یہاں کے تاریک غاروں میں زندگی

کے پاس حشرات کے ساتھ رہنا اختیار کیا اور اسے انطاآنی یقین کر کہ شہادت میں وہ انسان سے کم عدل و انصاف میں اس سے زیادہ ہیں۔ خیر! یہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ لیکن اے انطاآنی اب کاہنہ مصر کی وہ باتیں بھی سن لے جو تجھ سے متعلق ہیں۔

ملکہ کلیوپیٹرا جسے تو عورت سمجھتا ہے حقیقتاً خدا کا عذاب ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص اس سے چھو جانے کے بعد قسمت کے کوڑھ میں مبتلا ہونے سے بچ جائے کیا تجھے پامپیئس کا حال معلوم نہیں، کیا تو سیزر کے حشر سے ناواقف ہے اور کیا اس سے بے خبر ہے کہ ——— اس کی وجہ سے کتنے ملک ویران ہو گئے اور کتنی جانیں ہلاک۔ پھر ہوشیار ہو جا کہ آج کے بعد سے تجھے بھی کوئی مسرت و راحت نصیب نہیں ہو گی، اور اس حال میں تجھے مرنا ہے کہ نہ تیرے دوست تیرے پاس ہوں گے نہ اہل وطن، نہ تیرے عزیز تجھ سے قریب ہوں گے اور نہ تیری وہ محبوب ملکہ جس کی محبت میں تو نے اپنے وطن سے غداری کرنے میں بھی دریغ نہ کیا۔ تیری لاش پڑی ہو گی اور اس پر کوئی آنسو بہانے والا نہ ہو گا۔ تو تڑپ رہا ہو گا اور کوئی ایک ہاتھ بھی تجھے سنبھالنے کے لئے آگے نہ بڑھے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے لباس کے اندر سے چھپا ہوا خنجر نکالا اور خونخوار شیرنی کی طرح ہتیو کی طرف جھپٹ کر اس کے سینے میں ایسی سختی سے پیوست کر دیا کہ سانس لینے کی بھی مہلت نہ دی۔ خنجر اس کے دل کے اندر ڈوب گیا تھا۔ سینے سے خون کی دھار جاری تھی اور بڑھیا ایسی خوش تھی گویا دنیا کی دولت اسکے ہاتھ آ گئی ہے۔

اس نے مبہوت و متحیر انطانی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مجھے گمان بھی نہ تھا کہ کبھی میں اپنے بیٹے کے قاتل سے انتقام لے سکوں گی اس لئے اے انطاکی میں تیری شکرگذار ہوں کہ اپنے ساتھ تو اس کو بھی لے آیا اور اس طرح میری زندگی کا تنہا مقصود پورا ہو کر رہا۔ اچھا اے ناعاقبت اندیش اندھے عاشق۔ اب میں تجھ سے رخصت ہوتی ہوں۔ اس خائن کی لاش کو یہیں چھوڑ جانا کیونکہ آج رات میں نے یہاں کے بھیڑیوں اور گدھوں کو دعوت دی ہے اور جو کچھ میں نے تیرے متعلق کہا ہے اسے بھی یاد رکھنا۔ کیونکہ ممکن ہے پھر میں تجھ سے نہ مل سکوں۔"

یہ کہہ کر بڑھیا وہاں سے دفعتاً غائب ہو گئی اور انطاکی اسی طرح مبہوت و متحیر کھڑا رہا۔

(۲)

پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے ہر تاریخ داں واقف ہے۔ انطاکی پر بعد کو ایک وقت آیا کہ اس نے خودکشی کرنا چاہی لیکن اس کی شجاعت نے اجازت نہ دی، اس جنگ کے دوران میں اپنے آپ کو موت کے منھ میں ڈال ڈال دیا، لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ اور۔ پھر جب وہ مرا تو اس حال میں کہ نہ کوئی دوست پاس تھا نہ عزیز اور نہ کوئی رونے والا تھا، نہ اٹھانے والا۔ یہاں تک کہ کلیوپیٹرا بھی اس سے دور تھی۔ یہ واقعہ ہے سنہ ۳۰ قبل مسیح کا۔

ایک سپاہی کا عہد

یہ دسواں مرتبہ ہے کہ اہلِ عرب طرابلس کا قلعہ فتح کرنا چاہتے ہیں۔ چاروں طرف سے قلعہ گھیر لیا گیا ہے۔ اور نہایت سختی سے جنگ جاری ہے۔ محصورین بھی کچھ کمزور نہیں ہیں، برابر کا جواب دے رہے ہیں۔ آخر کار اہلِ عرب نے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ فی الحال پیچھے ہٹ جانا چاہیئے تاکہ پھر نئی قوت سے حملہ کیا جائے۔

یہ واقعہ ۵۸۱ھ یا ۱۱۵۵ء کا ہے۔ یوسف صلاح الدین ایوبی نے اس بات کی قسم کھائی ہے کہ دو سال کے اندر اندر وہ اپنے ممالک فرنگیوں سے واپس لے لیگا اور اورشلیم پر جسے صلیب پرستوں نے دوبارہ حاصل کر لیا تھا اسلامی علم نصب کر کے چین سے گا۔

سلطان نے یہ طے کیا کہ سب سے پہلے تمام طاقت طرابلس کی طرف صرف کرنا چاہیئے کیونکہ اورشلیم تک پہنچنے کا دروازہ یہی تھا اور مغرب کے سارے بیڑے اسی طرف سے ہو کر گذرتے تھے۔ اس لئے اگر یہ فتح ہو گیا تو تمام بیرونی امداد کا خاتمہ ہو جائے گا اور فرنگی زیر ہو جائیں گے۔

اس وقت طرابلس کا حاکم اور فرنگیوں کا قائد ایک نہایت جری شخص تھا۔

جسے مسلمان، "قومس تولوزی" اور یہودی "ریمون پنجم" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ الغرض عربوں اور فرنگیوں کے درمیان نہایت سخت خونریزی جاری تھی اور کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اس جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا۔

ٹھیک اسی زمانے میں، "لابنے لابنے" گھنے سرد کے جنگل میں ایک راہب رہتا تھا جس نے رات بسر کرنے کے لئے بھدی اور مضبوط چٹانوں کے اندر ایک جھونپڑی ڈال لی تھی۔ وہ دن رات اسی میں پڑا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت کسی سوچ میں رہتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے غیر معمولی آلام و مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کے متعلق کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ وہاں کے قرب و جوار کے رہنے والے اسے "فقیر" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اور خدا رسیدہ بزرگ سمجھتے تھے۔ انھیں اس کے گذشتہ حالات معلوم کرنے کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد آس پاس کی تمام آبادیوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ ہر جگہ اسی کا ذکر لوگوں کی زبانوں پر تھا لوگ اسے بہت بڑا ولی سمجھتے تھے۔ بلاتفریق مذہب سب اس کے پاس جاتے ہاتھوں کو چومتے اور دعائیں طلب کرتے۔ لوگوں کا جوش عقیدت اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ اس "سعادت" کے حصول میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اور شب و روز اس کی خدمت میں مصروف رہتے۔

زائرین میں ایک جوان اور خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ لانبا قد، کشادہ پیشانی سڈول جسم، بڑی بڑی غزالی آنکھیں، غرض وہ تمام چیزیں جو حسن کے مفہوم کو متعین کرسکتی ہیں اسے حاصل تھیں وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ آتی، اور اسکے ساتھ

ریمون دی تولوز " کا ایک سوار بھی ہمیشہ ساتھ رہتا۔

یہ کون ہے؟ اس کا اس گوشہ نشیں راہب سے کیا تعلق ہے؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔ لوگوں کو جو معلوم ہو سکا وہ صرف یہ تھا کہ اس کا نام "میری ٹریز" تھا۔ وہ ایک روز تنہا طرابلس کے حاکم "کونٹ ریمون دی تولوز" کے پاس گئی اور کہا کہ "میرے باپ جنگ صلیبی میں کام آچکے ہیں اور اب چونکہ میرے خاندان میں کوئی نہیں رہا اس لئے محل میں رہنے کی اجازت فرمائی جائے تاکہ ان عورتوں کے ساتھ جو اس میں رہتی ہیں اپنا غم غلط کرسکوں"۔

اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ "میں فرانس کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہوں، میں اس مقدس سرزمین میں اپنے والد کے ساتھ ایک نذر پوری کرنے آئی تھی اور ارادہ تھا کہ بیت المقدس کے فریضہ حج کو پورا کرکے وطن واپس جاؤں گی۔ لیکن والد نے چاہا کہ وہ بھی جنگ میں حصہ لیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں گھر سے بے گھر ہوگئی"۔

کونٹ ایمون بہت مہربانی سے پیش آیا اور اس نے محل میں رہنے کی اجازت دیدی۔ یہ ۱۱۷۵ء کا واقعہ ہے۔ اس روز سے یہ محل میں رہنے لگی۔ لیکن کونٹ کی اجازت سے یہ ہفتہ میں ایک بار خاص سوار کے ساتھ راہب سے ملنے ضرور جاتی تھی

اسی حال میں دس سال گذر گئے ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ لڑکی راہب کے پاس جاتی اور کونٹ بھی کبھی کبھی ساتھ جاتا۔ دسمبر ۱۱۸۵ء کی ایک صبح، کونٹ ریمون دی لوز، کے قصر کے پاس ایک نوجوان لبنان کا آیا اور اس نے وزیر طرابلس سے یہ کہہ کر ملنے کی خواہش کی کہ وہ راہب کے پاس سے پیغام لایا ہے۔

جب باریابی کی اجازت ملی تو اس نے راہب کی طرف سے سلام کے بعد کہا کہ۔ مقدس راہب نے جو ہم سب کے نزدیک نہایت ہی محترم اور بزرگ ہستی ہیں مجھے آپ کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ میں اس کی ایک خواہش آپ تک پہنچا دوں اس کی آرزو ہے کہ آپ اسی وقت "میری ٹریز" کے ساتھ تشریف لائیں۔ کیونکہ اگر آپ صبح تشریف لائے تو آپ سے غالباً ملاقات نہ ہو سکے گی "

اس گفتگو کو سن کر کاؤنٹ نہایت اضطراب و پریشانی کی حالت میں اٹھا، لڑکی کو آواز دی، اور فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر راہب کی اقامت گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

راہب کی حالت بہت زیادہ سقیم تھی۔ ضعف کا یہ عالم تھا کہ گفتگو کرنا مشکل تھا۔ اس نے لڑکی کی زانو پر سر ڈال دیا اور کاؤنٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ یوں گفتگو شروع کی:۔

"میرے محترم! وقت کا تقاضا ہے کہ میں اپنی حقیقت سے آپ کو مطلع کروں اور ان تمام رازوں سے جو میری زندگی سے متعلق ہیں آپ کو آگاہ کر دوں کیونکہ اب میرا آخری وقت ہے۔ موت سر پر آ چکی ہے ...... " چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ سانس پھولنے لگی، حلق سوکھ گیا، تھوڑی دیر تک چپ چاپ رہا اور پھر طاقت کو مجتمع کر کے سلسلۂ کلام جاری کیا ...... "کونٹ! "ہنری دی مونفور" کی باتیں جو اس وقت تم سے گفتگو کر رہا ہے ذرا غور سے سنو۔

ریمون دی تونزر نے تعجب سے اس کے جملہ کو دہرایا۔

"ہنری دی مونفور !؟"

"ہاں! ...... ہنری دی مونفور ...... آپ کو متعجب نہ ہونا چاہیے۔ تمام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بہادر فرانسیسی جو اپنی لڑکی کے ساتھ اس مقدس زمین کی زیارت کی غرض سے آیا تھا، جنگ میں کام آگیا۔ جس نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر قصداً اپنے نفس کو خطرے میں ڈالا تھا ......"

"ہاں! ..... ہم لوگوں کا ایسا ہی خیال ہے ...."

"مگر تم لوگ حقیقت سے واقف نہیں ہو ..... ہنری دی مونفور مرا نہیں ہے جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے، بلکہ وہ ابھی تک زندہ ہے اور وہ اس وقت تم سے گفتگو کر رہا ہے ..... میری تمام باتوں کو غور سے سنو تاکہ اس واقعہ کو اپنے بعد دوسروں تک منتقل کر سکو ...."

راہب نے چند منٹ خاموش رہ کر پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "ہم لوگ قدس سے واپس ہو کر ساحل لبنان کی طرف جا رہے تھے، ہمارا قافلہ بیس مرد اور تین عورتوں پر مشتمل تھا۔ انھیں میں میری یہ لڑکی بھی تھی ...... ہم لوگ نہایت اطمینان کے ساتھ نہایت تیزی سے آگے قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے کہ ایک گھنی جھاڑی میں دشمن کے گروہ سے مڈبھیڑ ہو گئی جو پہلے سے چھپے ہوئے بیٹھے تھے۔ اثنائے قتال میں میری نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جو گھائل ہو کر گر پڑا تھا اور ہم میں کا ایک شخص اس کا کام تمام کرنا چاہتا تھا، میں فوراً آگے بڑھا اور اس ارادے سے اس کو باز رکھا اور مجروح سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم اطمینان رکھو! جب تک میں یہاں موجود ہوں کوئی تمھیں ہلاک نہیں کر سکتا .... جنگ بہت جلد ختم ہو گئی۔ ہمیں شکست ہوئی، اور دشمن

ہمیں گرفتار کر کے اپنے سردار کے پاس لے چلے۔

"تم اس کے نام سے واقف ہو؟"

"امیر غالب الشہابی..... عربی النسل ہے حال ہی میں وادی تیم میں آیا ہے، سلطان کے ملک کا......"

"میں اس امیر سے خوب واقف ہوں۔ نہایت بہادر اور شجاع ہے"

"ہاں اس نے اپنی بہادری اور شجاعت کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیا ہے۔"

"اپنا واقعہ پورا کیجئے۔"

"ہم لوگوں کو امیر کے پاس لایا گیا............ یہ امیر وہی تھا جس کی جان میں نے جنگ کے سلسلے میں بچائی تھی......!"

"پھر تم نے اس سے کچھ کہا نہیں؟"

قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ بیڑیاں کاٹ دی جائیں اور مجھے آزاد کر دیا جائے۔

اس وقت میں اس بہادر کے سامنے تھا جس نے بڑے بڑے بہادروں کے قدم اکھاڑ دئے تھے۔ لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ میں نے اس سے کہا: "میرے محترم آپ نے مجھے اس لئے آزاد کیا ہے کہ میں نے اثنائے جنگ میں آپ کی جان بچائی تھی۔ لیکن میں آپ کی اس عنایت کے بجائے اپنی ایک دوسری خواہش کی تکمیل چاہتا ہوں امید ہے کہ مجھے رہا کر کے جس وسعت قلبی کا اظہار کیا گیا ہے اس معاملے میں بھی اسی سے کام لیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے

بجائے میری لڑکی کو آزاد کر دیا جائے جو ان قیدیوں میں شامل رہے۔ اور اس کی بیڑیاں مجھے پہنا دی جائیں۔"

"اس نے کیا جواب دیا؟"

"میری طرف اس نے گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اور اس نے انتہائی غصہ کی حالت میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "تم اپنی لڑکی کے ساتھ جا سکتے ہو۔۔۔۔۔۔" میں نے ہاتھ بڑھایا، اس نے مصافحہ کیا اور کہا "تم جا سکتے ہو۔"

میں نے کہا: "میں نے صرف آپ کی جان بچائی تھی۔ لیکن آپ نے اس کے بدلہ میں دو نعمتوں سے سرفراز کیا یعنی غلامی اور قید سے دو جانوں کو آزاد کیا۔ کیا مجھے اس بات کا موقع دیا جائے گا کہ میں اس احسان کا عوض پیش کر سکوں؟"

اس نے جواب دیا: "کہ اگر تمھاری یہ خواہش ہے تو بہترین عوض یہ ہو سکتا ہے کہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جنگ سے باز آ جاؤ۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

"میں نے اس کا وعدہ کر لیا۔"

"کیا تم نے ایسا ہی کیا؟" کونٹ نے پوچھا۔

"ہاں! میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ میں نے وعدہ کر لیا اور اسے میں کسی طرح توڑ نہیں سکتا تھا۔ اس وقت سے میں نے تہیہ کر لیا کہ اپنی بقیہ زندگی ان پہاڑوں میں بسر کر دوں گا تاکہ جنگ سے بالکل علیحدہ ہوں۔"

"اور تمھاری لڑکی ——— ؟"

"میری لڑکی!؟۔۔۔۔۔۔۔ کیا آپ نے ابھی تک نہیں پہچانا؟۔۔۔۔۔۔۔"

اس نے آپ کے یہاں پناہ لی ہے اور تقریباً دس سال سے آپ کے قصر میں مقیم ہے!"

"کیا میری ٹریزہ ؟"

"ہاں! میری ٹریزہ!!........ یہی میری لڑکی ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اس نے اپنا نام کسی کو نہیں بتلایا اور نہ اس کا اظہار کیا، وہ راہب جس کی ہر ہفتہ وہ زیارت کرتی ہے فی الواقع اس کا باپ "ہنری دی مونفورہ" ہے"

لڑکی یہ تمام باتیں بھی سنتی رہی، بالآخر دفور غم سے بیتاب ہو کر باپ کی گردن میں باہیں ڈال کر رونے لگی۔ فقیر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! اب میں اس عالم سے کوچ کر رہا ہوں۔ لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے مجھے خوشی ہے کہ مجھے اب تمھاری طرف سے کوئی فکر نہیں رہی...... میں تمھیں نہایت ہی وسیع النظر، عالی ہمت اور شریف شخص کے حوالے کرکے جا رہا ہوں تم یقیناً اپنے باپ کو کھو رہی ہو لیکن تم "ریمون دی تونور" کو اپنے باپ سے زیادہ مہربان، اپنے بھائی سے زیادہ خیر خواہ اور اپنے اعزہ واقارب سے زیادہ خیر خواہ پاؤ گی، وہ تمھاری ہر طرح مدد کرے گا" اس کے بعد وہ کونٹ کی طرف متوجہ ہوا، اور اپنے بستر سے کچھ میلے کچیلے کاغذ نکالے اور انھیں دیتے ہوئے بولا

"آپ انھیں حفاظت ...... سے۔ ان سے لڑکی کا حق وراثت ثابت ہوگا ان کے ذریعہ وہ اپنے حق کی مستحق ثابت ہوگی۔ اور.........."

راہب اس حد تک پہنچا تھا کہ آواز بالکل بند ہوگئی۔ چہرہ زرد پڑ گیا، ایک مرتبہ انگڑائی لی۔ حسرت بھری نگاہوں سے ایک مرتبہ اپنی بیٹی کو دیکھا اور ایک

ہچکی کے ساتھ ختم ہو گیا ۔

(۲)

اس کے بعد راہب (ہنری دی مونفور) کو کفنا کر اسی غار میں دفن کر دیا گیا اور ہر چہار جانب درخت لگا دئے گئے تاکہ ان کے ذریعہ اس کی حفاظت ہو سکے ۔

۱۱۸۶ء میں میری ٹریز سرد کے اس جنگل میں آئی تاکہ اپنے وطن فرانس جانے سے قبل ایک مرتبہ اپنے باپ کی زیارت کر سکے ۔

ٹھیک اسی روز جس دن دو لڑکی اپنے باپ کی زیارت کرنے گئی ہوئی تھی سلطان صلاح الدین اپنے عزم کے مطابق دو سال کے اندر اندر فاتح کی حیثیت سے اورشلیم میں داخل ہو رہا تھا ۔

یہ ۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) کا واقعہ ہے ۔

تاریخ مذہب کا ایک خونیں ورق

شارلکان یا کارلوس پنجم، ہسپانیہ کا ایک بادشاہ اپنی مملکت کی غیر معمولی وسعت پر بہت نازاں تھا۔ اور اس کا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ "میری سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا" لیکن اسے اپنی زندگی میں جو غیر معمولی کارناموں سے پُر نظر آتی تھی۔ بہت زیادہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ اپنی ساری عمر میں ایک رات بھی آرام سے نہ سو سکا، اس کی زندگی کروٹ ہی بدلتے بدلتے ختم ہو گئی، وہ اپنے وسیع ملک کی حفاظت کرتے کرتے اکتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر کار فرمانروائی اس کے لئے وبالِ جان ہو گئی اور وہ نہایت خوشی کے ساتھ حکومت سے دست بردار ہو گیا وہ اب سکون و اطمینان کا طالب تھا اور یہ جنس بازار سلطنت میں بالکل عنقا ہے۔ چنانچہ جس وقت اس نے حکومت سے دست برداری اختیار کی تو گرجاؤں میں اس کے لئے دعائیں مانگی گئیں کہ خدا اس کے گناہوں کو معاف کر دے۔ یہ ۱۵۵۵ء کا واقعہ ہے۔

شارلکان نے بڑے بڑے معرکوں میں شرکت کی تھی۔ بار بار خود دست بدست دشمنوں سے لڑا تھا۔ وہ فرانسوا اول شاہ فرانس، سلطان سلیمان قانونی فرمانروائے حکومت عثمانی اور ان کے علاوہ دوسرے بادشاہوں سے بھی

نبرد آزما ہوا تھا اور اس نے ان تمام جنگوں میں اپنے کو نہایت شجاع اور غیر معمولی بردبار مدبر اور جری ثابت کر دکھایا تھا۔ اسے کنیسہ کیتھولک کے مخالفین سے بھی سخت جنگ کرنی پڑی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے ان تمام لوگوں کو جنھوں نے پاپائے روم اور اس کی تعلیمات کی مخالفت کی تھی شہر بدر کر دیا۔

محکمہ تفتیش جسے شارلکان نے قائم کیا تھا۔ تاریخ کنیسہ میں نہایت بدنما داغ شمار کیا جاتا ہے اور یہ داغ اس بادشاہ کے نام اور اس کے ملک سے کسی طرح نہیں مٹایا جا سکتا۔

شارلکان حکومت سے علیحدہ ہونے کے تین سال بعد ۱۵۵۸ء میں انتقال کر گیا اور اس کے بعد تخت و تاج کا مالک اس کا لڑکا فلپ دوم قرار پایا۔ فلپ انصرام حکومت میں اپنے باپ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اور اس نے بھی اپنے باپ کے اتباع میں مخالفین کنیسہ کے اخراج و قتل کو برابر جاری رکھا۔

ان دونوں متعصب اور ظالم بادشاہوں کے دور حکومت میں ہسپانیہ نہایت دردناک حوادث کا مرکز بنا ہوا تھا اور اس زمانے میں ایسے ایسے واقعات رونما ہوئے جنھیں سننے کے بعد شقی سے شقی انسان بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب "لوتھر" جرمنی میں اصلاح مذہب عیسوی کی طرف متوجہ تھا۔ اور قدیم عقاید سے پھیر کر لوگوں کو اپنے جدید مذہب کی طرف دعوت دے رہا تھا۔ اول اول تو حکومت نے کوئی خاص توجہ اس طرف نہیں کی۔ لیکن جب لوگ جوق در جوق اس مسلک میں شامل ہونے لگے تو قدامت پرست اہلِ روما اس خطرناک تحریک سے چیخ اٹھے اور انھوں نے

یک زبان ہو کر۔ لوتھر" اور اس کے متبعین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے یورپ کے مسیحی بادشاہوں سے امداد کی درخواست کی۔

شارلکان نے فوراً اس دعوت کو قبول کر لیا اور ہر ممکن طریقہ سے اسکے استیصال پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ شارلکان کے محکمہ تفتیش نے ہر طرف جاسوس پھیلا دیے اور متہمین کو جلا وطنی اور آگ میں ڈالنے کی سزا دی جانے لگی، یہاں تک کہ ہسپانیہ کے ہر گلی کوچہ سے دردناک صدائیں بلند ہونے لگیں۔

(۲)

ڈاکٹر" کازالا" جو ہسپانیہ کے دارالسلطنت میڈرڈ میں قصر شاہی کے بالکل قریب رہتا تھا اور وہاں کے کنیسہ کا کاہن تھا " لوتھر" کا مسلک اختیار کرنے کے لئے روانہ ہوا اور جب وہاں سے واپس آیا تو پوشیدہ طور پر اس جدید مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ ڈاکٹر کازالا کا خیال تھا کہ لوتھر جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل حق ہے۔ اور اس کے مخالفین صریح غلطی پر ہیں۔

ڈاکٹر مذکور نے واپسی کے بعد" بلدالولید" میں اقامت اختیار کی، کیونکہ وہاں اس کی ایک اچھی خاصی جماعت قائم ہو چکی تھی اس نے اس کا نام " لوتھر" رکھا۔

اسی اثنا میں شارلکان کا انتقال ہو گیا۔ تخت پر اس کا لڑکا فلپ ثانی بیٹھا۔ اس نے مخالفین کنیسہ کی نگرانی کی طرف اور زیادہ توجہ کی، اور آخر کار اس کے جاسوس اس جگہ کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں

ڈاکٹر کازالا اپنے متبعین کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ ایک رات کو فوج نے اس مکان کا اچانک محاصرہ کرلیا اور تیس آدمی گرفتار کر کے محکمۂ تفتیش کے حوالے کر دیئے گئے ڈاکٹر کازالا مع اپنی بہن اور بھائی کے بھاگا۔ مگر فوج برابر پیچھا کرتی رہی اور جامعۂ قرطبہ تک پہنچی جہاں ڈاکٹر کازالا نے اس خیال سے پناہ لی تھی کہ شاید یہاں تک حکومت کے افراد نہیں پہنچ سکتے ڈاکٹر کے بھائی بہن تہ خانے میں جان بچانے کی غرض سے چھپے ہوئے تھے۔ لیکن فوج انکی تلاش میں بالآخر کامیاب ہوئی اور انھیں بھی گرفتار کر کے محکمۂ تفتیش نے ان کے متعلق دو روز تک غور و خوض کے بعد اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

اگر اس وقت بھی کوئی سیاح ہسپانیہ کے دارالسلطنت میڈرڈ میں جائے اور وہاں کے کتب خانہ میں اس زمانے کی مطبوعہ اور قلمی تاریخ کا مطالعہ کرے تو اس کے اندر ایک مجلد قلمی وثیقہ اس کو نظر آئے گا۔ جس پر لکھا ہوگا کہ "اسلامی ۱۵۵۹ء کو کفار کی ایک جماعت "بلداولیدہ" میں جلائی گئی"۔

اس کی تفصیل یوں ہے :-

صبح کے وقت تقریباً ۸ بجے ولی عہد "دون کاروس" جس کی عمر اس وقت ۱۴ سال سے زیادہ نہ تھی مع اپنی بہن "جونا" کے وہاں گیا۔ عظمائے سلطنت، کنیساؤں کے پوپ اور محکمۂ تفتیش کے صدر جسے سراغ رسانی میں بہت زیادہ شہرت حاصل تھی ولیعہد کے ساتھ تھا۔ "جونا" کے جلو میں نہایت خوبصورت لباس زیب تن کئے ہوئے بہت سی سہیلیاں بھی وہاں موجود تھیں ولی عہد اور جونا دونوں وہاں جاکر ایک جگہ بیٹھ گئے اور گرفتار شدہ لوگ لائے

نئے پوپ "ملکیور کازا" نے اپنا خطبہ شروع کیا۔ لیکن ہنگامہ کچھ اس قدر تھا کہ ایک لفظ بھی سننے میں نہ آسکا۔ اس کے بعد دوسرا پوپ آگے بڑھا۔ ہنگامہ بالکل فرو ہو گیا۔ ہر چہار جانب سکوت چھا گیا۔ اس نے ہاتھ میں چاندی کی صلیب لے کر اپنی گرجتی ہوئی آواز سے کہا کہ "امیر اور امیرہ کو خدا کے سامنے قسم کھانی ہوگی کہ وہ محکمۂ تفتیش کی طرف سے ہمیشہ مدافعت کریں گے۔" اس پر امیر اور امیرہ نے بیک زبان آمین کہی اور وعدہ کیا کہ وہ پوپ کے مطالبہ کو ہمیشہ منظور کریں گے۔ اس کے بعد جج "فرجارا" آیا اور اس نے ملزمین کے متعلق اپنا فیصلہ صادر کیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر "کازالا" کا خادم لایا گیا۔ اس کے بعد کازالا کا بھائی، اور پھر اس کی بہن اور دوسرے تیس آدمی۔ ان میں سے ۱۶ کو حبس دوام کی سزا دی گئی اور چودہ کو آگ میں ڈالے جانے کی۔ لیکن قبل اس کے کہ ان کو آگ میں ڈالا جاتا۔ فوج کو حکم دیا گیا کہ ان سب کا گلا گھونٹ دیں جن کے قتل کا حکم دیا گیا تھا ان میں ایک چودہ برس کی معصوم لڑکی بھی تھی جس کا نام "کالتیا نادی" تھا اس نے جلاد سے نہایت عاجزی کے ساتھ کہا کہ اسے دیر تک تکلیف میں مبتلا نہ رکھا جائے۔ مگر افسوس اس نے یہ تمنا ایسے شقی کے سامنے پیش کی تھی جو کبھی اسے پورا نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ تمام مجرمین میں اسی کو سب سے زیادہ تکلیف دے کر قتل کیا گیا۔ آخر میں اسی فرقہ کے سردار ڈاکٹر کازالا کو لایا گیا۔ چونکہ شہنشاہ شارلکان اس سے بہت محبت رکھتا تھا اور اس کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر کو زندگی کے آخری لمحہ تک توی امید تھی کہ فلپ ثانی اسے معاف کردے گا۔ مگر اس کی

یہ تمنا پوری نہ ہو سکی ۔ اسے بھی دیگر رفقاء کی طرح گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ اسکے بعد مشتعل آگ کے حوالے کر دیا گیا جنھیں زندہ جلانے کا حکم دیا گیا تھا وہ جب آگ میں پہنچنے کے بعد چیختے تھے تو سپاہی انھیں نیزوں سے مار کر
خاموش کر دیتے تھے ۔ محکمۂ تفتیش کی اس درندگی کی آگ جب ڈاکٹر کازالا کے جلانے کے بعد بھی کم نہ ہوئی تو اس کی ماں کی قبر کھدوا کر اس کی سڑی گلی ہڈیاں نکلوائیں اور ڈاکٹر کی نعش کے ساتھ ان کو بھی آگ میں ڈال دیا۔

آگ اور خون سے کھیلنے والا فرمانروا

آگ۔ آگ۔ آگ ـــــ !!

یہی ایک کلمہ تھا جو ہزاروں خشک زبانوں پر جاری تھا اور رد ما کے گوشہ گوشہ میں گونج رہا تھا۔ لوگوں کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے، لب ہلانے کی بھی طاقت ان میں باقی نہ تھی لیکن اب بھی ایک خشک چیخ، کی صورت میں جو آواز پیدا ہوتی تھی وہ یہی تھی کہ آگ۔ آگ !!

کامل تین گھنٹے آتش زدگی کو ہو چکے تھے لوگوں کے ہنگامے و اضطراب، شور و شیون کا یہ عالم تھا، گویا کرۂ زمین کا دل دھڑک رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت باہر نکل پڑے۔

آگ نے شہر کے تمام مکانوں اور معبدوں کو اندر باہر چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور دھوئیں کے بادلوں سے جو لال لال شعلے بلند ہو ہو کر نمودار ہو رہے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں اور "رگ سنگ" کا ہر ہر شراہ لہو میں تبدیل ہو گیا ہے۔

مکانوں کی چھتیں عجیب و غریب دھماکے کی آواز سے گر رہی تھیں جس کے ساتھ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی چیخیں مل کر ایسا ہیبت ناک منظر پیش

کر رہی تھی کہ اسے سوا خدا کے اور کوئی صبر و سکون سے دیکھ ہی نہ سکتا تھا شہر کے معابد اور وہاں کے قیمتی سامان۔ ہیکلوں کی قربان گاہیں اور وہاں کے مقدس ہدایا سب آگ کی نذر ہو چکے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آسمان و زمین کے سب سے بڑے دیو کے سامنے آج سب سے بڑی قربانی پیش کی جا رہی ہے۔

ٹھیک یہی وقت تھا کہ نیرو۔ روما کا شہنشاہ اعظم۔ قصر کے اندر سے مسکراتا ہوا۔ اٹکھیلیاں کرتا ہوا برآمد ہوا۔ سیکڑوں خدام مشعلیں لئے ہوئے اس کے آگے آگے تھے۔ اور امراء دربار زرق برق لباسوں کے ساتھ اس کے جلو میں۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی اور رخساروں پر خوشی کی لہک، لبوں پر اطمینان و سکون کا تبسم تھا اور رفتار میں عجیب و غریب "انداز گلگشت"۔ اس کے ہاتھ میں اس کا محبوب سرود تھا جس کے تاروں پر اس کی انگلیاں اس طرح چل رہی تھیں گویا اس سے بہتر فرصتِ نغمہ اس کو کبھی مل ہی نہیں سکتی۔ شعلوں کی لپٹیں گویا اس کے لئے باد نسیم کے جھونکے تھے جو اسے مست کئے ہوئے تھے اور مخلوق کی چیخ و پکار گویا نغمہ الوہیت تھی جس کے ساتھ سرود کے تاروں کو چھیڑنے میں وہ سماوی سکون محسوس کرتا تھا۔

یہ واقعہ ۶۴ء کا ہے جبکہ روما پر حکمرانی کرتے ہوئے نیرو کا گیارہواں سال گذر رہا تھا۔

(۲)

جب آگ کا دیوتا اپنی نذریں لے کر رخصت ہو گیا اور سارا شہر خاکستر کا ڈھیر

نظر آنے لگا تو نیرون بھی اپنے قصر کو واپس آیا اور ہاتھ سے سر و رکھ کر مسند
پر بیٹھ گیا۔ جس کے سرخ اطلس کو فینیقیا کی خوبصورت لڑکیوں کے خوبصورت
ہاتھوں نے بنا تھا۔

نیرون نے امراء دربار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آج میں نے شہر روما کو
خاک سیاہ کر کے واقعات عالم میں ایک ایسے واقعہ کا اضافہ کیا ہے جس کو
دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور جو تاریخ کے صفحات پر جلی سرخ حروف
سے لکھا جائے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ میں روما کی خاک پر ایک اور دوسرا
شہر بناؤں گا۔ جس کے عظمت و جمال کے سامنے تم قدیم شہر کو بھول جاؤ گے

نیرون کی شخصیت کو تاریخ نے جس طرح پیش کیا ہے اس سے ہر
شخص واقف ہے اور جہاں کہیں اس کا نام آتا ہے "آتشزن روما" کی صفت
بھی ضرور استعمال کی جاتی ہے دنیا میں بڑے بڑے ہیبت و جبروت والے
بادشاہ گذرے ہیں۔ ظلم و ستم سے کھیلنے والی بڑی بڑی ہستیاں گذر چکی
ہیں۔ لیکن آگ اور خون کی جتنی پیاس نیرون کو تھی اتنی کسی کو نہ تھی۔

نیرون کی شخصیت صرف اپنی سنگ دلی اور شقاوت و بیرحمی ہی کے
لئے مشہور نہ تھی بلکہ مجموعہ اضداد ہونے کی حیثیت سے بھی دنیا نے اسے
حیرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیرون مجموعہ تھا۔ بہت سے
ایسے آدمیوں جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد طبیعت رکھتے تھے اور نہیں
کہا جا سکتا تھا کہ خود اسے کیا سمجھا جائے۔

وہ حد درجہ سنگ دل تھا اور اتنا ہی رحیم المزاج، وہ بے انتہا غضب ناک شخص

تھا اور اتنا ہی محبت کرنے والا۔ وہ ایک مصلح تھا خرابات پسند، وہ ایک شاعر تھا دشمنِ شعر و شاعری وہ ایک موسیقار تھا عدوئے نغمہ و موسیقی۔ الغرض یہ کچھ تھا نیرون جو روما کو آگ لگا کر سرود بجانے میں معروف تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی لطف و کرم سے کام نہیں لیا۔ مگر صرف ایک بار لیکن اس لطف کا کتنا بڑا معاوضہ وہ پہلے ہی وصول کر چکا تھا۔ اس کا حال ذیل کے واقعہ سے معلوم ہوگا۔

نیرون اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے اور امراء چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہیں، غلامانِ زریں کمر سیکڑوں کی تعداد میں تعمیل احکام کے لئے سر جھکائے ہوئے کھڑے ہیں اور فرطِ ہیبت سے قصر میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ دفعتاً اس کی شیر کی سی آواز بلند ہوتی ہے اور حکم دیتا ہے کہ شراب حاضر کی جائے۔"

خدام میں ایک شخص یونانی الاصل بھی تھا جو اپنے آقا کے وطن ایتھنس سے بھاگ کر یہاں آگیا تھا اور جسے نیرون نے آبدار خانہ کا داروغہ بنا دیا تھا۔ اس کا نام دیوموس تھا۔

نیرون نے غلاموں سے کہا کہ "حاضرین کو خوب جام بھر بھر کر شرابیں پلاؤ کیونکہ آج کا دن میری انتہائی مسرت کا دن ہے۔ اور آگ کے خوبصورت منظر سے جو سکر پیدا ہوا ہے اسے اس قدر جلد ختم نہ ہونا چاہیئے"

پیالے جام بھر بھر کے دئے جانے لگے لوگوں نے خالی کرنا شروع کئے اور نشہ کی سرخیاں حاضرین کے چہروں پر دوڑ گئیں۔ لیکن دیوموس اس وقت موجود نہ تھا اور باہر آبدار خانے کے انتظام میں مصروف تھا۔ نیرون

کو دفعتاً خیال آیا اور اس نے پوچھا کہ "دیوموس آج یہاں نظر نہیں آتا؟ کہاں ہے" جواب ملا کہ "باہر انتظام میں مصروف ہے۔"

یہ سنتے ہی نیرون کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور باڈی گارڈ کا افسر جو دروازہ پر کھڑا ہوا تھا مخاطب ہو کر کہا کہ "میں نے دیوموس کو حکم نہیں دیا تھا کہ وہ دعوتوں میں مجھے ہمیشہ اپنے ہی ہاتھ سے شراب پلائے۔ پھر وہ کیوں نہیں آیا۔ جاؤ اس ملعون یونانی کو ابھی پکڑ کر حاضر کرو۔"

دیوموس کانپتا ہوا سامنے آیا اور قدموں پر گر کر معافی چاہی کہ "میں نے عمداً یہ خطا نہیں کی ہے بلکہ باہر کے انتظام میں اتنا مصروف تھا کہ حاضری کا خیال دل سے نکل گیا۔"

لیکن نیرون، جس نے آج تک کبھی کسی کا عذر نہیں سنا تھا، اس کا عذر کیوں سنتا۔ اس نے عصائے شاہی اٹھایا اور اس زور سے اس کے سر پر مارا کہ خون کا فوارہ سر سے جاری ہو گیا۔ اور وہ بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔ نیرون نے حکم دیا کہ ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کو ایک طرف ڈال دیا جائے جب دعوت ختم ہونے کا وقت قریب آیا اور ہر شخص کے دماغ پر شراب پوری طرح مسلط ہو گئی تو نیرون نے حکم دیا کہ "دیوموس کو سامنے لایا جائے" اور پھر جلاد کو بلا کر حکم دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دے چنانچہ جلاد نے اسکے دونوں ہاتھ تلوار کی ایک ضرب سے جدا کر دئے۔ اس حال میں کہ نیرون اور تمام امراء اس کی تکلیف اور تڑپ کو دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔

"کیا تمھیں بہت تکلیف ہے۔؟"

"ہاں! یہ اذیت ناقابل برداشت ہے اور اس لئے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم چھری لے کر میرا کام تمام کر دو تاکہ اس عذاب سے مجھے نجات مل سکے"

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ہم غلام سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور میرا فرض ہے کہ جس طرح ممکن ہو تمھیں زندہ رہنے دوں اور تمھاری خدمت کروں۔"

جس وقت دیوموس کے ہاتھ کاٹے گئے تو اس نے اپنے ایک ساتھی افریقی غلام سے کہا کہ تم مجھے ہلاک کر ڈالو کیونکہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے لیکن اس نے اس پر عمل نہیں کیا بلکہ قصر کے ایک گوشے میں لے جا کر اس کی خدمت و تیمارداری شروع کی۔ یہاں تک کہ اس کے زخم اچھے ہو گئے اور رفتہ رفتہ تمام وہ کام جو ہاتھ سے کیا کرتا تھا پاؤں کی مدد سے انجام دینے لگا — نیرون کا معمول تھا کہ کبھی کبھی وہ خود قصر کے مختلف حصوں میں جا کر دیکھا کرتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے۔ چنانچہ ایک دن اتفاق سے اس کا گذر وہاں بھی ہوا جہاں دیوموس پاؤں سے برتن صاف کر رہا تھا۔ نیرون اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور حیرت سے دیکھنے لگا کہ یہ کون ہے جو پاؤں سے ہاتھ کا کام لے رہا ہے۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ دیوموس یہی ہے جس کے ہاتھ اس نے کسی وقت قطع کرائے تھے۔

نیرون نے محل واپس جا کر داروغہ کو بلایا۔ اور پوچھا کہ "یہ کون تھا جو پاؤں سے برتن صاف کر رہا تھا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ "اے آقا!

یہ آپ ہی کا دیرینہ غلام دیوموس یونانی ہے۔ جس کے ہاتھ کاٹے جانے کا آپ نے حکم دیا تھا۔ موت اس کی قسمت میں نہ لکھی تھی اس لئے بچ گیا، اور بدستور اپنے آقا کی خدمت میں مصروف ہے۔"

نیرون یہ سن کر بہت متاثر ہوا۔ (اس کی زندگی کا یہ بالکل پہلا اور آخری تاثر تھا) اور حکم دیا کہ، دیوموس کو حاضر کیا جائے۔

دیوموس سامنے آیا تو نیرون نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اے میرے بھائی، اس میں شک نہیں کہ میں نے تمھارے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا؛ لیکن امید ہے کہ اب تم معاف کر دو گے۔" نیرون کی زندگی کا یہ بالکل پہلا واقعہ تھا کہ اس نے کسی سے معافی چاہی ہو۔ دیوموس اس کے قدموں پر گر پڑا اور بولا کہ "اے آقا، آپ میری جان کے مالک تھے اور ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا وہ بھی حق بجانب تھا اور اب جو کچھ کریں گے وہ بھی بالکل درست ہوگا۔"

نیرون نے کہا کہ "آج میں تمھیں آزاد کرتا ہوں اور اپنے قصر کا محافظ مقرر کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے دیوموس کو رخصت کیا اور متعدد غلام اسکی خدمت کے لئے مامور ہو گئے۔

اس کے بعد دس سال تک دیوموس اور زندہ رہا اور پاؤں سے کام کرنے کی ایسی مشق بہم پہنچائی کہ نقاشی و بت تراشی میں بھی اس نے خاص شہرت حاصل کی۔ چنانچہ اس نے نیرون کا بھی ایک مجسمہ تیار کیا، جو نیرون کی خواب گاہ میں ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ جب ۶۸ء میں نیرون

کا انتقال ہوا تو یہ مجسمہ بھی توڑ دیا گیا لیکن دیوموس بدستور اپنی خدمت پر مامور رہا کیونکہ سارا روما اس کے کمال نقاشی کا معترف تھا۔

نہ اب نیرون باقی ہے، نہ دیوموس لیکن ایک کے ظلم وستم اور دوسرے کے صبر وتحمل کی داستان ہنوز زندہ ہے۔ ممکن ہے نیرون کی روح اب بھی اس بات پر نازاں ہو کہ اسی کی وجہ سے روما کو اتنا بڑا صاحب کمال نقاش میسر ہوا۔

۲۴ اگست ۱۵۷۲ء

یعنی

تاریخِ مذہب کا وہ تاریک دن جس کی نظیر چنگیز و ہلاکو بھی پیش نہ کر سکے

اگست کی ۲۴ تاریخ ہے اور مطلع غبار آلود۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کے ٹکڑے آہستہ آہستہ جمع ہو رہے ہیں۔ اور تاریکی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ دوپہر کے بعد آفتاب نے پھر اپنی صورت نہیں دکھائی۔ شام ہوتی ہے اور چاند طلوع ہوتا ہے لیکن حد درجہ سوگوار و غمگین۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی بادلوں میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے اور تارے بھی زمین والوں کی طرف سے اپنا منہ موڑ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ہوا میں تیزی شروع ہوتی ہے اور بڑھتے بڑھتے اس میں ایک کراہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ زمین کانپنے لگتی ہے۔ آسمان تھرا اٹھتا ہے اور کائنات کی فضا صرف ان چیخوں سے معمور نظر آتی ہے جو قتل گاہ سان بارتلومیو سے بلند ہوئی تھیں۔

مسلسل ۳۶۳ سال سے اگست کی یہ تاریخ ہر سال یہی منظر پیش کر رہی ہے

اور قیامت تک پیش کرتی رہے گی۔ آپ شاید محسوس نہ کرتے ہوں گے، لیکن آئیے مختصراً اس داستان کو سن لیجئے۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد میری طرح اس تاریخ کا یہ سوگوار منظر آپ کے دل میں بھی ہمیشہ کے لئے منقوش ہو جائے۔

(۲)

یہ اس زمانے کی بات ہے جب یورپ میں پروٹسٹنٹ مذہب آہستہ آہستہ ترقی پا رہا ہے اور کیتھولک مذہب کی طرف سے لوگ متنفر ہو رہے ہیں، یعنی یہ اس وقت کا ذکر ہے۔ جب مذہب کی قدامت پرستی، عقلیت پسندی اختیار کرتی جاتی تھی۔ یوں تو یورپ کے تمام ممالک میں اس جدید مسلک کی اشاعت ہو رہی تھی۔ لیکن فرانس کی سرزمین اس کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوئی اور وہاں اس نے بہت جلد کافی جماعت پیدا کر لی تھی۔ تاہم چونکہ بعض امراء اب تک قدیم کیتھولک مذہب پر قائم تھے اس لئے فضا حد درجہ مکدر تھی اور لوگوں کے دل ایک دوسرے کے خلاف حسد و کینہ سے لبریز نظر آتے تھے۔

شاہ فرانس، ہنری ثانی کا انتقال ہو چکا ہے اور اپنے پیچھے اپنی بیوہ ملکہ کاترین کو چھوڑ گیا ہے اور اپنے بیٹے شارل کو۔ کاترین حد درجہ خود سر، مغرور و سنگ دل عورت ہے جس نے اپنے چاروں طرف ملک کے قومی نوجوانوں کو جمع کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور اس کو جس طرف چاہتی ہے حرکت دیتی ہے۔ ہر چند ہنری کے بعد اس کا بیٹا شارل ہی تخت نشین ہوا تھا لیکن کاترین نے اس کو اس درجہ لہو و لعب میں ڈال دیا تھا کہ اسے مطلق خبر نہ تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور خود وہی جو چاہتی تھی کرتی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جب پروٹسٹنٹ مذہب وہاں غیر معمولی ترقی کر رہا تھا اور بڑے بڑے امراء اس کو اختیار کر چکے تھے تاہم چونکہ کیتھولک مذہب کے پیرو بھی کم نہ تھے اور بعض امراء ہنوز اس قدیم مسلک پر قائم تھے اس لئے ایک عجیب قسم کی خوفناک فضا اس ملک میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس تصادم کا نتیجہ کیا ہو گا۔

کیتھولک مذہب کا سب سے بڑا حامی ڈیوک دی جیز تھا جو ملکہ کے نہایت مقرب حاشیہ نشینوں میں سے تھا اور کسی وقت اس سے علیحدہ نہ ہوتا تھا۔ اول تو ملکہ خود کیتھولک مذہب رکھتی تھی۔ دوسرے دی جیز کی معیت، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پروٹسٹنٹ جماعت کی سخت مخالف ہو گئی اور ایسی آتش انتقام اس کے دل میں بھڑک اٹھی کہ وہ ہر وقت بے چین رہنے لگی۔ پھر چونکہ پروٹسٹنٹ امراء کی بھی جماعت کافی تھی اور اس میں کولینی اور دی کونڈا ایسے صاحب اقتدار امراء بھی شامل تھے اس لئے وہ کھلم کھلا مخالفت بھی نہ کر سکتی تھی۔ اور دونوں جماعتوں کے ساتھ بظاہر یکساں سلوک مناسب خیال کرتی تھی لیکن حقیقتاً وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی اور ہر وقت اسی فکر میں لگی رہتی تھی کہ پروٹسٹنٹ کافروں سے کیونکر ملک کو پاک کرے۔

(۳)

اسی دوران میں ہنری دی ناوار نے جو پروٹسٹنٹ جماعت کا سب سے بڑا سردار تھا ملکہ کاترین کی بیٹی کے لئے پیغام بھیجا اور اس نے پسند کر کے ۱۸ اگست ۱۵۷۲ء تاریخ عقد مقرر کر دی۔

کاترین چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کی یہ شادی اس اہتمام سے ہو کہ تاریخ میں

اس کی نظیر نہ ملے اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ ان واقعات کا اعادہ کر ہی نہیں سکتی جو اس شادی کے پردے میں ظاہر ہوئے۔ محافل نشاط کے انتظامات ہو رہے تھے۔ دعوتوں اور تفریحوں کے پروگرام تیار ہو رہے تھے اور در پردہ وہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ جس نے اگست کی ۲۴ر تاریخ کو ابدالآباد کے لئے غیر فانی بنا دیا۔

کاترین نے اپنے تمام مقرب امراء اور ارکان حرب کو پوشیدہ طور پر طلب کیا اور پروٹسٹنٹ جماعت سے انتقام لینے کی اسکیم پیش کی۔ جس کو سن کر سب کے دل کانپ گئے اور اس کے بیٹے شارل نے تو صاف انکار کر دیا۔ لیکن کاترین کی چالیں ایسی نہ تھیں کہ شارل کا انکار یا امراء کا پس و پیش قائم رہتا۔ آخر کا سب کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور نکاح کے بعد تیسری رات یعنی اگست کی ۲۴ر تاریخ اس کام کے لئے تجویز کی گئی۔

۲۳ر اگست کو کاترین کے ساتھیوں نے کام شروع کر دیا۔ یعنی غروب آفتاب سے قبل شہر کے ان تمام مکانات پر جن میں پروٹسٹنٹ رہتے تھے مخصوص نشانات بنا دیے تاکہ کیتھولک جماعت کے مکانات سے وہ نمایاں طور پر الگ پہچان لئے جائیں۔

(۴)

۲۴ر اگست کی رات ہے اور پیرس بقعۂ نور ہو رہا ہے تمام پروٹسٹنٹ شرفاء و امراء شاہی دعوت میں شریک ہیں اور ہر چہار طرف ہنگامۂ رقص و سرود برپا ہے۔

دفعتاً ملکہ کاترین کوئی عذر کر کے چلی جاتی ہے اور اندر کے ہال میں خفیہ طور پر اپنے ساتھیوں کو طلب کر کے پوچھتی ہے کہ "کیا تم سب تیار ہو؟" اس کے بعد وہ ڈیوک دی جیز سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ "میں چند منٹ کے بعد پیرس کی گلیوں کی سیر کرنے

کے لئے اپنے قصر سے باہر نکلوں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ میری یہ چہل قدمی ایسی جوئے خون میں ہو جہاں میں کم از کم زانو تک تو غرق ہو جاؤں۔"

یہ سن کر سب نے سرِ اطاعت خم کر دیا اور وہ یہ کہہ کر کہ "ہاں اب وقت آگیا تیار ہو جاؤ" مسکراتی ہوئی پھر اس محفل طرب میں آگئی جہاں سے وہ گئی تھی۔

(۵)

نصف شب ہو چکی ہے اور بزم رقص و سرود انتہائی نقطۂ تکمیل تک پہنچ گئی ہے کہ دفعتاً گرجاؤں سے ناقوس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ خدا اور مذہب کے نام پر اب خونریزی شروع کر دینا چاہئے۔ یہ آواز ہنوز فضا میں گونجتی ہوتی ہے کہ قتل عام شروع ہو جاتا ہے۔ بزم شادی میں شریک ہونے والے تمام پروٹسٹنٹ امرا دفعتاً محصور کر لئے جاتے ہیں اور جو محفل اس سے پہلے صرف نغمۂ و رقص اور ہنگامۂ نوشا نوش کے لئے وقف تھی۔ اب وہاں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ سر کٹ کٹ کر فرش پر گر رہے تھے۔ گردنوں سے خون کے فوارے جاری تھے، لاشے ہر چہار طرف تڑپ رہے تھے۔ اور ہر جام بلوریں بجائے شراب کے اب لہو سے لبریز نظر آتا تھا۔ ٹھیک اسی وقت جب قصر شاہی کے اندر یہ خونی کھیل کھیلا جا رہا تھا، شہر کے ہر گوشے سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اور کیتھولک جماعت پروٹسٹنٹ آبادی کے قتل عام میں مصروف تھی نہ بچہ کی تمیز تھی نہ عورت کی، نہ بیمار پر رحم تھا نہ ضعیف پر۔ مذہب کا خون آشام دیوتا۔ بپھرا ہوا تھا اور انسانی جان کی قربانیوں پر قربانیاں طلب کر رہا تھا۔ وہ خون کا پیاسا تھا اور کسی طرح اس کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ معصوم بچے ماؤں کی گود سے چھین چھین کر آگ

میں ڈالے جارہے تھے۔ اوران کے نرم نرم گوشت کے جلنے سے جو بو پھیل رہی تھی اس کو سونگھ سونگھ کر یہ دیوتا خوش ہورہا تھا حسین عورتوں کو برہنہ کرکر کے انکا جسم نیزوں سے چھلنی کیا جاتا تھا اوران کی چیخ سن سن کر یہ خونخوار دیوتا ناچ رہا تھا۔

یہی وقت تھا اور یہی اس کا خونین منظر کہ کاترین اپنے موکب شاہانہ کے ساتھ مسکراتی ہوئی قصر سے باہر نکلی تاکہ وہ لاشوں کو تڑپتے دیکھے اور خوش ہو۔ مکانوں کو جلتے ہوئے دیکھے اور مسرور ہو۔ وہ خراماں خراماں چلی جارہی تھی کہ راستے میں ایک لاش سے ٹھوکر کھاکر گری اور اس کے گھٹنے خون آلود ہوگئے لوگوں نے اسے فوراً سنبھالا اور وہ پھر آگے روانہ ہوگئی۔ کچھ دور چل کر اسے ایک کیتھولک سردار ملا جو خون آلود تلوار لئے ہوئے سر سے پاؤں تک لہو میں شرابور تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی اور بولی کہ "شکار کی خبریں سناؤ" اس نے کہا کہ "اب تلواریں نیام میں ہیں اور لاشے میدان میں"

اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا کہ "میری تمنا تو یہ تھی کہ گلیوں میں کم ازکم گھٹنے گھٹنے تو خون نظر آتا" سردار نے ملکہ کے خون آلود گھٹنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ "ملکۂ عالم کی یہ خواہش تو پوری ہوگئی"۔

وہ یہ سنکر بے اختیار ہنس پڑی اور رات بھر ہنستی رہی یہاں تک کہ جب ۲۵ راگست کا آفتاب طلوع ہوا تو وہ جاگ رہی تھی اور پروٹسٹنٹ جماعت کا ایک ایک فرد موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو چکا تھا۔

روما کا دورِ استبداد

روما کی شہر پناہ سے باہر، دریا کے کنارے، گنجان درختوں کے خنک سایہ میں جلبا بیٹھا ہوا ہے اور پاس ہی اس کی بیوی نیرا لیٹی ہوئی ہے جو یونان کی خوبصورت عورتوں میں خاص امتیاز رکھتی تھی۔ ہر چند جلبا افریقہ کا رہنے والا تھا اور ایک یونانی عورت سے اس کا پیوند کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ لیکن محبت نے جو بہری بھی ہے اور اندھی بھی۔ نیرا کو نہ نوجوانانِ روما کی التجا کی طرف متوجہ ہونے دیا نہ ہی قدردانِ یونان کی تیکھی صورتوں پر، اور جلبا کا گرویدہ بنا دیا جو یقیناً اپنی شکل و صورت کے لحاظ سے تو بہت معمولی انسان تھا۔ لیکن اپنی فطرت و سیرت کے لحاظ سے واقعی غیر معمولی شخص تھا۔

نیرا، زمین پر اپنی دونوں کہنیاں ٹکائے ہوئے تھی اور ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھے ہوئے جلبا کی پرشوق، باتیں سن رہی تھی اور کبھی کبھی محبت بھری آنکھوں سے اسے دیکھ بھی لیتی تھی۔

جلبا نے کہا: "اے نیرا آؤ ہم تم دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگیں کہ خدا ہماری محبت کو اسی طرح قائم اور دشمنوں کے فتنہ و فساد سے محفوظ رکھے۔"

نیرا اٹھ بیٹھی اور جلبا کے گلے میں باہیں ڈال کر بولی کہ ——"اے جلبا اے

میری زندگی کے تنہا مالک، میں تو روز صبح کو اٹھ کر یہی دعا مانگا کرتی ہوں۔ جب تم محل چلے جاتے ہو تو میں گڑگڑا کر خدا سے یہی التجا کرتی ہوں کہ بارالہا میرے جلبا کو دشمنوں کے حسد سے محفوظ رکھ اور شہنشاہ کی نگاہ میں اُسے اور زیادہ عزیز بنا دے۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ خدانخواستہ اگر تمھیں کوئی گزند پہنچ گیا تو میں کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتی۔"

جلبا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ —— نیرا —— تم اس سے بے فکر رہو کہ دشمنوں کی چالیں مجھے کوئی نقصان پہنچا سکیں گی۔ کیونکہ شہنشاہ کی بڑھتی ہوئی عنایتیں میری حفاظت کی ضامن ہیں۔ تم کو معلوم ہوگا کہ پہلے میں قصر شاہی میں ایک غلام کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن لڑائیوں میں میری خدمتوں اور جانبازیوں کو دیکھ کر شہنشاہ نے غلامی کی زنجیریں کاٹ دیں اور مجھے صف اول کے امرا میں جگہ دی۔ اے نیرا! تجھے خبر نہیں کہ اس غلامی کی زندگی کو میں نے کس تکلیف و مصیبت سے کاٹا ہے اس لئے نہیں کہ میں غلام تھا ———— بلکہ صرف اس لئے کہ اس حال میں نہ تم سے محبت کر سکتا تھا اور نہ تمہاری تمنا دل میں لا سکتا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ وہ دن آیا جس کی آرزو میں میں تڑپ رہا تھا۔ شہنشاہ نے مجھے آزاد کیا اور میں اپنی محبت تیرے قدموں پر نثار کرنے کے قابل ہو سکا۔

ہر چند میں افریقہ کے کسی غلام گھرانے میں پیدا نہ ہوا تھا بلکہ میرے والدین آزاد تھے اپنے قبائل کے سردار تھے۔ جب یونان کے لشکر نے افریقہ کے صحراؤں پر فتح حاصل کی تو میں بھی اسیر جنگ کی حیثیت سے روما لے آیا گیا اور قصر شاہی کے غلاموں میں شامل کر دیا گیا۔ اُس وقت میری عمر ۲۰ سال کی تھی۔

نیرا نے بات کاٹ کر کہا " اے جلبا، مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے اور مجھے تمھارے اصل و نسل کی وجہ سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم شریف ابن شریف ہو اور تمھارے خصائل خود اس بات کے شاہد ہیں "

جلبا بولا " اے نیرا، کچھ بھی ہو میرے لئے یہ داغ غلامی سخت تکلیف دہ تھا اور میں رات دن اسی فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح یہ دور ہو۔ سو خدا کا شکر ہے کہ شہنشاہ کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ میرے ہاتھ بہ نسبت شراب پلانے کے تلوار چلانے کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ اور جس کو وہ غلام سمجھتا ہے اس کی رگوں میں انتہائی آزاد خون دوڑ رہا ہے۔ ایک معرکہ میں شہنشاہ نیرون کی جان سخت خطرے میں پڑ گئی تھی اور دشمن کی فوج کا ایک سپاہی اپنا نیزہ شہنشاہ کے سینے میں پیوست کرنے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر ایک ہی وار میں اس کا سر قلم کر دیا۔ شہنشاہ نے خوش ہو کر مجھے آزاد کر دیا۔ اور امراء کی صف میں جگہ دے کر خاص اپنی باڈی گارڈ کا افسر بنا دیا۔ نیرا سچ کہو کیا میں نے اپنی آزادی بہت سستے داموں خریدی ہے؟ "

نیرا نے فرطِ محبت میں اپنے ہونٹ اس کے لبوں سے ملا دیئے۔ گویا جلبا نے جو کچھ کہا تھا اس پر مہر توثیق ثبت کر دی ہے۔

(۲)

جلبا کی عمر ۳۰ سال کی تھی جب اس کی شادی نیرا سے ہوئی۔ نیرا، سپہ سالار مسا، لوکوڈس کے ایک دوست کی بیٹی تھی جو لڑائی میں مارا گیا تھا اپنے دوست کی موت کے بعد لوکولوس نے نیرا کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا جو خود بھی بیٹیوں ہی کی

طرح اس سے محبت کرتی تھی۔

جب تک جلبا آزاد نہ ہوا تھا، نہ اس میں ہمت تھی کہ وہ نیرا کے لئے پیام دے اور نہ نیرا اس کو ممکن سمجھتی تھی لیکن جب جلبا کا داغ غلامی دور ہو گیا تو لوکوتوس نے خوشی سے ان اقتران کو منظور کر لیا اور نیرا کو اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

یہ واقعہ ۶۶ء کا ہے جب نیرون کو تخت روما پر بیٹھے ہوئے تیرہ سال کا زمانہ گذر گیا تھا اور کامل دس سال جلبا کو غلامی کی زندگی بسر کرتے ہوئے ہوگئے تھے۔ شادی کے بعد ان دونوں کی زندگی جیسی مسرور گذر رہی تھی وہ حقیقتاً ایک ایسا شیریں خواب تھی جس سے بیدار ہونے کی فرصت نہ جلبا کو تھی نہ نیرا کو لیکن ان غریبوں کو کیا خبر تھی کہ شام وصال کی صبح کس قدر جلد، کتنی اچانک آجاتی ہے۔

اس گفتگو کے بعد جلبا اپنی بیوی نیرا سے رخصت ہو کر قصر شاہی میں پہنچا اور نیرون کے حضور میں حاضر ہو کر نیرا سے اپنے عقد کا حال بیان کیا۔

جلبا اپنی گفتگو ختم بھی نہ کرنے پایا تھا کہ نیرون کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور اس نے جلبا سے پوچھا "اے جلبا تو کس لڑکی کا ذکر کر رہا ہے۔ کیا تو نے لوکوتوس کی بیٹی نیرا سے عقد کیا ہے؟" یہ سن کر جلبا نے اپنا سر جھکا لیا۔

نیرون ایک لمحہ خاموش رہا، اس کے بعد اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کا تبسم نمودار ہوا۔ جس کا مطلب جلبا کچھ نہ سمجھ سکا اور بولا "اے جلبا، مجھے یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ میری طرف سے اپنی بیوی کو مبارکباد پہنچاؤ اور

کہہ دو کہ جس طرح میں تم پر مہربان ہوں۔ اسی طرح اس پر بھی ہمیشہ اپنی عنایت صرف کروں گا اور تم دونوں کی اولاد پر بھی اگر تمہاری قسمت میں کوئی اولاد لکھی ہے۔"

جلبا فرطِ عقیدت سے زمین بوس ہوا اور نیرون کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

(۳)

جلبا اپنی خدمات سے فارغ ہو کر گھر کی طرف لوٹا لیکن قبل اس کے کہ وہ مکان کے اندر داخل ہوتا۔ اس کو معلوم ہوا کہ محلہ میں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے دریافت کرے گا۔ لیکن اسی وقت محلہ کی ایک عورت کی آواز اس کے کانوں میں پڑی جو پڑوسن سے کہہ رہی تھی کہ۔ "ہاں، ہاں، میں نے خود دیکھا کہ سپاہیوں نے اسے آ کر پکڑا، اور گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ غریب کا شوہر بھی گھر پر موجود نہ تھا"

جلبا یہ سن کر سراسیمہ ہو گیا اور فوراً گھر پہنچا۔ یہاں آ کر دیکھا کہ محلہ والے جمع ہیں اور اس کی ضعیف خادمہ سے سارا حال دریافت کر رہے ہیں اسکو دیکھتے ہی خادمہ نے اپنا سر پیٹ لیا اور سارا حال بیان کیا کہ سپاہی کیونکر گھر میں گھس کر زبردستی نیرا کو لے گئے۔

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اب وہ سمجھا کہ نیرون کے اس تبسم کا کیا مطلب تھا جو نیرا کی شادی کا حال سن کر اس کے چہرے پر پیدا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش سکتہ کی سی حالت میں کھڑا رہا اور پھر اس نے ایک نہ ضبط ہونے والے جوش کے ساتھ اس حال میں کہ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل

رہی تھیں۔ مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اے لوگو! گواہ رہو، میں اس آگ کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کی ہم تم سب پرستش کرتے ہیں کہ میں اب اس گھر میں زندہ واپس نہ آؤں گا۔ نیرون نے میرے ماں باپ کو ہلاک کیا۔ میرے وطن کو تباہ کیا۔ میری آزادی کو چھینا اور اب وہ میری بیوی بھی لینا چاہتا ہے۔ سو یہ قیامت تک ممکن نہیں۔ اگر نیرون کو میں ہلاک نہ کر سکا تو نیرا اور اس کے ساتھ ہی میری موت یقینی ہے۔"

لوگ اسے سمجھاتے رہے لیکن وہ ایک مجنوں کی طرح صفیں چیرتا ہوا قصر کی طرف واپس گیا۔

(۴)

جس وقت وہ محل کے پھاٹک پر پہنچا تو غصہ سے اس کا چہرہ سرخ تھا اور منہ سے کف جاری تھا۔ لیکن پہرہ والوں نے اسے نہیں روکا۔ کیونکہ سب اس کے مرتبہ سے واقف تھے وہ سیدھا اس کمرے میں پہنچا جہاں نیرون کے سامنے عورتیں گرفتار کر کے پیش کی جاتی تھیں اور دروازے پر پہنچتے ہی اسکی آنکھوں نے سخت ہولناک منظر دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ نیرا بے حس و حرکت فرش پر پڑی ہوئی ہے اور آثار حیات بالکل مفقود ہیں۔ قصر کے سرداروں کی ایک جماعت جن کے ساتھ وہ خود بھی کام کرتا تھا۔ لاش کے گرد موجود ہے اور جلبا کو رحم و لطف کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں

آخر کار جماعت میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور بولا: "اے جلبا! ہم سب کے دل تمھارے لئے کڑھ رہے ہیں اور نیرا کی موت پر آنسو بہا رہے ہیں

لیکن اسی کے ساتھ کچھ مسرت بھی شامل ہے اور وہ یہ کہ تمہاری بیوی جیسی زندگی میں پاک دامن رہی ہے ویسی ہی وہ مرنے کے بعد بھی ہے اس نے تمہارے ناموس کو آخر وقت تک قائم رکھا اور اپنے لانبے لانبے بالوں سے خود اپنا گلا گھونٹ کر نیروؔن کو اس کا موقع نہ دیا کہ وہ اس کی عزت پر حملہ کرتا۔

جلباؔ خاموشی سے اسے سنتا رہا اس حال میں کہ آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا اور اس سینہ سانس کی آمد و شد کے لئے تنگ نظر آتا تھا جب اس کیفیت میں کچھ کمی پیدا ہوئی تو آگے بڑھا اور نیرا کی لاش پر جتنے آنسو باقی رہ گئے تھے وہ بھی اس نے بہا دیئے اور پھر ایک ایسی دردناک آواز کے ساتھ جس میں کاہنوں کی سی ہیبت ناک پیشن گوئی شامل تھی بولا کہ "اے نیروؔن، —— اے سلطنت روما کے ملعون ترین فرمانروا۔ سن لے کہ اب تیرے ظلم کی عمر ختم ہو گئی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب تجھ کو بھی تنگ آکر اسی طرح جان دینا پڑے گی جس طرح نیرا نے دی" یہ کہہ کر اس نے خنجر نکالا اور آناً فاناً اپنے سینہ میں پیوست کر دیا۔

اس واقعہ کو ٹھیک ایک سال کا زمانہ گذرا تھا کہ ۶۸ء میں نیروؔن کے خلاف ملک نے بغاوت کی اور نیروؔن کو آخر کار خودکشی کرنا پڑی۔

مسلمانوں کا عسکری اخلاق

اے سرزمین فلسطین کے مسافر، گر فرصت ہو تو تھوڑی دیر کے لئے حطین کے پہاڑ اور اس کی مختصر آبادی (طبریہ) پر بھی ایک نگاہ ڈال لے جو اس وقت خواہ کتنی ہی گمنام ہو لیکن زمانہ ماضی میں غیر معمولی شہرت کی مالک تھی۔

طبریہ کی شہر پناہ جو کوہ آتش فشاں کے سیاہ پتھروں سے تیار کی گئی تھی ہر چند ۱۸۳۷ء کے زلزلہ میں تباہ ہو چکی ہے۔ لیکن اس مسماریوں اور بربادیوں میں ہنوز اس کی زبردست قوت حرب و دماغ کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔

(۲)

سولہ سال قبل ولادت مسیح ہیروڈس نے اس قریہ کی بنیاد ڈالی اور اس کے بعد اور شلیم کے تباہ ہونے پر اسرائیلیوں نے اس کو اپنا پایہ تخت بنایا ۶۳۷ء میں حضرت عمرؓ نے اس کو حکومت اسلام میں شامل کیا لیکن حروب صلیبی کے دوران میں یہ مسیحی پادریوں کا مرکز قرار پایا۔ ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس پر قبضہ کیا اور تقریباً ایک صدی بعد ۱۲۴۰ء سے ۱۲۴۷ء تک پھر صلیبیوں کے پاس رہا۔ اس کے بعد تیسری بار پھر عربوں کے تصرف میں آگیا اور ان سے ترکوں نے لے لیا۔ یہاں تک کہ "شیخ ظاہر" نے باب عالی کے خلاف بغاوت

کی اور اس مقام کو اپنا مرکز قرار دیا

(۳)

۵۸۲ھ ہے اور ربیع الثانی کی دسویں تاریخ اس ناہموار سڑک پر جو شہر صور سے قلعہ عکا کو جاتی ہے دو سوار جو عربی گھوڑوں پر سوار ہیں مختلف سمتوں سے آتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور بیک وقت دونوں کی زبان سے حیرت و مسرت کے الفاظ نکلتے ہیں۔

ایک نے کہا " اے ناصر میں تو تمھارے ہی پاس جارہا تھا۔ میرا سردار کونٹ روڈ ... پر حملہ کی تیاری کررہا ہے اور مجھے بھی اس کے ساتھ جانا ہے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ تم سے آخری بار چل کر مل لوں۔ کس کو خبر ہے کہ زندہ واپس آؤں یا نہیں "

دوسرا بولا " اے فلپ میں بھی تم سے رخصت ہونے آرہا تھا کیونکہ سلطان صلاح الدین لشکر کشی کا حکم دے چکا ہے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہو "

اس گفتگو کے بعد دونوں سوار اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر وہیں ایک چٹان پر بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

(۴)

فلپ۔ فرانسیسی نوجوان تھا اور کونٹ روڈ کی فوج سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ کونٹ، صرف حروبِ صلیبی میں حصہ لینے کے لئے فرانس سے آیا تھا اور مختلف جنگوں میں اپنی جرأت کا ثبوت دے چکا تھا۔

ایک دن کوہستان نابلس میں جنگ جاری تھی کہ میدان حرب کے کسی گوشہ میں فلپ کو ایک مجروح شخص نظر آیا جو زخموں سے چور چور تھا اور پیاس سے تڑپ

رہا تھا۔ فلپ نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو ایک مشہور عربی سردار ہے جس کو فلپ بارہا دیکھ چکا تھا اور جس کی شجاعت کا لوہا فرانسیسی مانے ہوئے تھے۔

فلپ نے فوراً اس کو پانی پلایا۔ اور اس کا سر اپنی ران پر رکھ کر زخموں کو دھونے لگا۔ جب عربی سردار کو کچھ سکون ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور صلیبی سپاہی کو اپنے سرہانے دیکھ کر بولا کہ "اے نوجوان مجھے جلدی ہلاک کر ڈال کیونکہ میرا جو فرض تھا وہ ادا کر چکا ہوں اور مجھے اب زندگی میں کوئی تمنا باقی نہیں۔" فلپ نے جواب دیا "اے معزز سردار، کیا تم نے کبھی یہ سنا ہے کہ رونڈ میر کے کسی سپاہی نے مجروح و بے دست و پا دشمن پر حملہ کیا ہو۔ اے عامر، اے تھامہ کے سردار میں میدان جنگ میں تم کو اور تمھاری شجاعت کو بارہا دیکھ چکا ہوں اور اس لئے مجھ سے زیادہ بزدل کون ہو سکتا ہے، اگر میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں۔"

(۵)

یہ جنگ ختم ہو گئی اور نتیجہ مسلمانوں کے خلاف نکلا۔ لیکن فلپ پھر واپس نہیں گیا اور عامر کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کے علاج میں مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ صحت یاب ہو گیا۔ اس کے بعد دونوں جبل لبنان کی طرف چلے گئے اور عرصہ تک خاموش زندگی بسر کرتے رہے۔ درانحالیکہ صلیبی جنگیں برابر جاری تھیں اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں ہنگامۂ حرب و قتال بدستور قائم رہا۔

ایک دن عامر نے اپنے دوست فلپ سے کہا کہ "اگر تمھاری رائے ہو تو میں وادی یتیم جاکر اپنے اعزہ و اقربا کو دیکھ آؤں۔"

فلپ نے جواب دیا کہ "میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ عکار جاکر اپنے عزیزوں

سے مل آؤں ۔ چنانچہ یہ دونوں دوست ایک دوسرے سے علیحدہ ہوکر اپنی اپنی منزل مقصود پر روانہ ہو گئے ۔

جب عامر دادی تیم میں پہنچا تو اس کی قوم کے لوگ بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ اس کو مردہ تصور کر چکے تھے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حریف صلاح الدین فوجیں جمع کرکے طبریہ پہنچکر مسلمانوں کی کمک کے لئے پہنچنا چاہتا تھا

اُدھر فلپ جب عکا پر پہنچا تو وہاں بھی مسیحی فوجیں طبریہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہی تھیں اور اس طرح جب یہ دونوں شرکت جنگ پر مجبور ہو گئے تو انھوں نے چاہا کہ ایک دوسرے سے مل لیں اور اس ارادے سے یہ دونوں اپنی اپنی جگہ سے چل کھڑے ہوئے اور راستہ میں دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی ۔

(۶)

صلاح الدین جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور عزم کر چکا ہے کہ جس طرح ممکن ہوگا وہ صلیبیوں سے تمام اماکن مقدسہ کو پاک کرکے رہے گا ۔ چنانچہ اس نے اعلان جہاد کرکے ہر چہار طرف سے مجاہدین کو جمع کرنا شروع کر دیا

کامل ایک سال گزر چکا ہے اور جنگ پوری قوت کے ساتھ جاری ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، وادیوں میں، قلعوں کے اندر و باہر عکا سے اورشلیم تک اور نابلس سے کرک تک ہر جگہ خون سے رنگین نظر آتی ہے ۔

جب سلطان کو معلوم ہوا کہ مسیحیوں کی ایک تازہ فوج سمندر عبور کرکے آرہی ہے تو اس نے ایک لشکر زین الدین دارم کی قیادت میں حلب سے دوسرا لشکر قیماز النجمی کی سیادت میں دمشق سے، تیسرا مظفر الدین کوکی کی قیادت میں

اطراف صحرا سے طلب کرکے شہر طبریہ پر پوری قوت سے حملہ کر دیا۔
اس طرف سے صلیبیوں کی طرف سے بھی مدافعت کی پوری تیاریاں تھیں اس لئے مسلمانوں کے ساحل بحر تک پہنچنے سے پہلے ہی دونوں لشکروں کا تصادم ہوگیا یہ دن سنیچر کا تھا اور ۵۸۳ھ کے ربیع الثانی کی ۲۵ تاریخ ۔

(۷)

دونوں فریق کی جنگ کا اس وقت یہ انداز تھا جیسے شیر آپس میں لڑ رہے ہوں کیونکہ ان میں سے ہر ایک جانتا تھا کہ ارض مقدس کے فیصلہ کا قبضہ اسی جنگ پر منحصر ہے ۔ گردنوں سے سر کٹ کٹ کر گر رہے تھے ۔ تیر پر تیر سینوں میں آکر پیوست ہو رہے تھے ۔ لاشوں پر لاشیں گرتی جا رہی تھیں اور خون نہروں کی طرح ہر چہار طرف بہہ رہا تھا۔ آخر کار کئی گھنٹے تک یہ قیامت ہنگامہ جاری رہنے کے بعد مسیحی فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے ـــــــــــــــ اس جنگ میں پیادہ و سوار ۸۰ ہزار صلیبیوں نے شرکت کی تھی جس میں سے سوائے چند ہزار کے سب کام آ گئے اور بقیۃ السیف نے پناہ طلب کر لی ۔

(۸)

صلاح الدین نے کہا ۔ " اے عامر اس قیدی کو لے کر تو کیا کرے گا ۔؟"
عامر بولا ۔" اے مولیٰ ! آپ کو یاد ہوگا کہ میدان قتال میں جب میں آپ کے سامنے سے گذرا اس حال میں کہ میری تلوار خون سے رنگین تھی تو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد آپ میری ایک تمنا ضرور پوری کریں گے۔ چنانچہ اب میں وہی تمنا پیش کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ صلاح الدین نے آج تک

عہد شکنی کبھی نہیں کی۔"

صلاح الدین نے کہا "اے عامر تو اس قیدی کی جان بخشی چاہتا ہے جس نے میدان جنگ میں صلاح الدین کی گردن جدا کرنا چاہی تھی۔"

عامر نے جواب دیا "اے آقا! اگر یہ کوئی معمولی سپاہی ہوتا تو میں کچھ نہ کہتا لیکن یہ شخص صلیبیوں کا بڑا مشہور جری سردار ہے اور ایک بار میری جان بچا چکا ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ آج میں اس کی جان بچاؤں۔"

سلطان صلاح الدین نے حکم دیا کہ قیدی لایا جائے۔ چنانچہ فلپ سامنے لایا گیا اور صلاح الدین نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "اے سردار میں تیری جان بخشی کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تو میرے اس احسان کو کبھی فراموش نہ کرے گا۔"

فلپ نے کہا "اے سلطان میں جانتا ہوں کہ میری جان بخشی کا سبب عامر ہے اور اگر وہ میرا شفیع نہ ہوتا تو آپ ضرور مجھے قتل کر دیتے۔ اس لئے میرے شکریہ کا مستحق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف عامر۔"

صلاح الدین نے جواب دیا "یہ تو نے صحیح کہا کہ عامر نہ ہوتا تو میں یقیناً تجھے قتل کرا دیتا۔ لیکن اب تیرے جواب سے معلوم ہوا کہ واقعی تو شجاع انسان ہے اس لئے آ اور میرے اس ہاتھ سے ہاتھ ملا جو سوائے ایک شجاع انسان کے کسی اور کے لئے آج تک آگے نہیں بڑھا۔ میں نہ صرف تیری جان بخشی کرتا ہوں بلکہ تجھے آزاد بھی کرتا ہوں۔ اے میرے عزیز جا اور ایک آزاد بھائی کی سی زندگی بسر کر۔"

چنانچہ عامر نے اپنے خاندان سے علیحدہ ہو کر اور فلپ نے اپنی قوم سے

جدا ہو کر زہد و اتقا کے کامل تین سال ایک ساتھ سامرہ کے پہاڑ میں بسر کر دیئے
جبل زیتون کی بلندی پر ایک گھنا سایہ دار درخت ہے جس کے نیچے
دو قبریں نظر آتی ہیں جن میں سے ایک پر پتھر نصب ہے اور دوسری پر لکڑی
کی صلیب۔ یہ قبریں عامر اور فلپ کی ہیں جنھوں نے مذہب کے نام پر
تو ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھائی۔ لیکن انسانیت کے نام پر دونوں
نے مل کر ساتھ ہی جان دی۔

دریائے نیل کی دیوی

امبابہ کے میدان میں مراد بک فرانسیسیوں کے مقابلہ کی تیاریاں کررہا ہے۔ صفیں آراستہ ہورہی ہیں، توپیں خاص خاص جگہ قائم کی جارہی ہیں، سواروں کا دستہ اپنے گھوڑوں کے ساز و براق کو درست کررہا ہے اور مراد بک اپنے ساتھیوں کو سمجھا رہا ہے کہ یہ ہماری کامیابی کا آخری موقعہ ہے اور اگر ہم فرانسیسی فوجوں کو اس جگہ منتشر کرسکے تو قسمت یقیناً ہمارے ساتھ ہے۔

جولائی ۱۷۹۸ء کی اکیس تاریخ ہے کہ فرانسیسی اور مصری فوجیں امبابہ کے میدان میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں۔ ادھر مراد بک ہے اور ادھر نپولین بوناپارٹ، جو اسکندریہ سے یلغار کرتا ہوا قاہرہ جارہا ہے اور امبابہ کے مقام پر مراد بک کو راستہ روکے ہوئے پاتا ہے۔

امبابہ کی یہ لڑائی مملوکوں کی تاریخ حکومت میں آخری لڑائی تھی جو مصر کو نپولین کے حملے سے بچانے کے لئے لڑی گئی تھی۔ اور جس کا نتیجہ موافق نہ نکلا، مملوک سواروں نے بڑی جوانمردی سے فرانسیسی فوجوں پر حملے کئے۔ لیکن ان حملوں کی صورت بالکل ایسی تھی جیسے سمندر کی موجیں چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آجائیں کہا جاتا ہے کہ مملوکوں کی اس شکست کا باعث یہ تھا کہ ان کی توپیں بہت بھاری

تھیں اور وہ فوج کے ساتھ ساتھ آسانی سے منتقل نہ کی جاسکتی تھیں۔ بہرحال سبب یہ ہو یا کچھ اور مملوکوں کو شکست ہوئی۔ اور سات ہزار سپاہی ان کے مارے گئے زخمیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ مراد بیک البتہ بچ گیا اور ڈھائی ہزار سپاہ کے ساتھ صحرا کی طرف نکل گیا۔

دوسرے دن جنرل ڈیپوئی قاہرہ میں داخل ہو گیا اور نپولین کی طرف سے قبضہ کا اعلان کر کے فرانس کا جمہوری جھنڈا وہاں نصب کر دیا اور ۲۵ جولائی کو فرانسیسی فوج نے قاہرہ کے چاروں طرف چھاؤنی ڈال دی۔

جس وقت امبابہ میں لڑائی جاری تھی۔ ٹھیک اس وقت فرانسیسی فوج کے دو سپاہی جو ایک دوسرے کے حقیقی بھائی تھے اور بعض کا نام لوفو اتھا، گھبرا کر بھاگ نکلے اور کامل سات دن تک ادھر ادھر چھپتے پھرتے رہے آٹھویں دن وہ جزیرہ روضہ میں پہنچے جہاں ساحل پر ایک مصری نوجوان اپنی چھوٹی سی کشتی میں مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا۔ اس کا نام عبدالوہاب تھا۔

ان فرانسیسی سپاہیوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ انھیں دوسرے کنارے پہنچا دے وہ راضی ہو گیا اور یہ دونوں کشتیوں پر بیٹھ گئے۔

مصری نوجوان کی بیوی نے جو پاس ہی مکان کے دروازے پر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اپنے شوہر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اور اس نے وہیں سے جواب دیا کہ میں ابھی ان کو پہنچا کر واپس آتا ہوں۔ وہ دیکھتی رہی کشتی کی رفتار چپوؤں کی حرکت اور اپنے محبوب شوہر کے مضبوط بازوؤں کی جنبش کو دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ کشتی دریائے نیل کے بیچ میں پہنچ گئی وہ مطمئن تھی کہ اس کا

شوہر نصف راستہ طے کر چکا ہے اور باقی نصف بھی جلد طے کر لے گا دفعتاً فرانسیسی سپاہیوں نے مصری نوجوان کو مارنا شروع کیا اور جب وہ بیہوش ہو گیا تو دریائے نیل کے اندر ڈال دیا اور نیل کی موجیں اپنے آغوش میں لے خدا جانے کہاں اس کی لاش کو لے گئیں

مصری نوجوان کی بیوی یہ منظر دیکھ دیکھ کر چیخ رہی تھی۔ لیکن کوئی اس کی فریاد کو سننے والا نہ تھا۔ یہاں تک کہ خدیجہ روتی روتی بیدم ہو گئی اور اس نے دریائے نیل کی طرف اپنے دوپٹہ کا آنچل پھیلا کر کہا کہ "اے دریائے نیل کی دیوی اس ظلم کا انتقام میں تجھی پر چھوڑتی ہوں" اس حادثہ کے بعد یہ غریب اپنے ایک عزیز کے گھر چلی گئی جسے سید بدر کہتے تھے

اگست کی پہلی تاریخ ہے اور انگریزی بیڑہ کا سردار نلسن، ابوقیر کی خلیج میں فرانسیسی بیڑہ کو درہم برہم کر چکا ہے۔ فرانسیسی فوج میں انتشار پیدا ہو گیا ہے اور اپنے کمانڈر کے خلاف ان میں سخت برہمی پائی جاتی ہے اس کے اثر سے قاہرہ بھی محفوظ نہیں رہتا اور وہاں کے اکابر نپولین کے خلاف سازش کرنے لگتے ہیں۔

نپولین، جو مصیبت میں گھبرانا جانتا ہی نہ تھا، ۱۸ راگست "عید وفا نیل" کی تقریب میں پورے حشم و خدم کے ساتھ باہر نکلتا ہے اور مقصود یہ ہے کہ مصر والوں کی تالیف قلوب کر کے ان کی ہمدردی حاصل کرے۔

چنانچہ ایک بہت بلند اسٹیج بنایا جاتا ہے اور وہاں نپولین اپنے تمام سرداروں کے ساتھ اس عید کی خوشی میں مصر والوں کے ساتھ شریک ہونے کے لئے آتا ہے۔

فوج کے بڑے بڑے افسر، مصر کے تمام شرفا و اکابر جمع ہیں، عربی و فرانسیسی موسیقی چاروں طرف گونج رہی ہے، جشن و مسرت کی لہر ہر جگہ دوڑتی نظر آتی ہے کہ دفعتاً دریائے نیل کی طرف سے ایک ہنگامہ کی آواز کانوں میں آتی ہے فوج کے

لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑتے ہیں اور کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر ہنگامہ کی حقیقت معلوم کرنے روانہ ہو جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ واپس آتے ہیں اور نپولین کو اطلاع دیتے ہیں کہ فرانسیسی سپاہیوں کا ایک دستہ دریا کی سیر میں مصروف تھا کہ کشتی الٹ گئی۔ بیس سپاہی جو تیرنا اچھی طرح نہ جانتے تھے ڈوب گئے اور صرف دو بچ رہے۔ ان ڈوبنے والوں میں لوفوا بھی تھا۔

سید بدر جو اس تماشہ کو دیکھ رہا تھا گھر واپس آیا اور اس نے انتہائی مسرت کے عالم میں خدیجہ کو آواز دے کر کہا کہ "اے خوش ہو کہ تیرے شوہر کا ایک قاتل تو ختم ہو گیا۔

خدیجہ یہ سنکر مسکرائی اور بولی "میں جانتی تھی کہ نیل کی دیوی ضرور انتقام لے گی"

نپولین، وادی نیل فتح کرنے کے بعد اس فکر میں تھا کہ وہ سوریا کو بھی اپنے قبضہ میں لے آئے، چنانچہ اس نے چاروں طرف فوجیں روانہ کیں اور جنرل دیزی کو مراد بک اور الفی بک وغیرہ مملوکی امرا ء کے مقابلے کے لئے بھیجا جو ابھی تک قابو میں نہ آئے تھے۔

جنرل دیزی نے ان سب کو رفتہ رفتہ زیر کر لیا اور سواحل نیل پر واقع ہونے والے تمام شہروں پر فرانسیسی جھنڈا لہرنے لگا۔ اسی طرح جنرل ددجا نے منصورہ کو فتح کیا اور نپولین خود قاہرہ کے انتظام میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ بظاہر چاروں طرف پوری طرح اس کا تسلط قائم ہو گیا۔

لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں انقلاب کے جذبات بدستور موجزن تھے، راکھ کے نیچے چنگاریاں دبی ہوئی تھیں اور ان کے بھڑک اٹھنے کے

لئے ہوا کا ایک جھونکا کافی تھا۔

گو نپولین نے انعام و اکرام اور ہدایا و عطایا کی بارش سے بعض اہلِ مصر کو ایک حد تک مانوس کر لیا تھا، لیکن جمہور کے دل ہنوز غم و غصہ سے لبریز تھے اور وہ کسی طرح گوارا نہ کرتے تھے کہ یورپ سے بے دین ان پر حکومت کریں۔

چونکہ مصر کی مہم میں نپولین بہت کچھ خرچ کر چکا تھا اور اب تسلط قائم رکھنے کے لئے اسے اور زیادہ روپے کی ضرورت تھی اس لئے وہ مجبور ہوا کہ اہلِ مصر ہی سے یہ مصارف وصول کرے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ مصر کے تمام وہ لوگ جو املاک و جائداد یا سند ملکیت رکھتے ہیں۔ ان کو چاہئے کہ افسر خزانہ کے پاس جا کر اپنی ملکیتوں کے اندراج کرالیں۔ اس حکم کا اعلان ہوتے ہی سارے ملک میں یہ خبر اڑ گئی کہ نپولین لوگوں کی جائداد چھیننا چاہتا ہے۔ چنانچہ ۲۲ اگست ۱۷۹۸ء کو انقلاب شروع ہو گیا اور نوجوانوں کی جماعت نے نہایت برافروختہ ہو کر علمِ بغاوت بلند کر دیا انھیں جماعتوں میں سے ایک جماعت سید بدر کی بھی تھی جس میں ہزار جوان شامل تھے

جس وقت قاہرہ حاکم جنرل دیبوی کو یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ اس فتنہ کو فرو کرنے کے لئے فوج کا ایک دستہ لے کر باہر نکل آیا اور سیدھا شیخ عبداللہ الشرقاوی کے مکان پر گیا جو اس وقت وہاں کے بڑے ذی اثر علماء میں سے تھے۔

جب اہلِ مصر کو معلوم ہوا کہ جنرل دیبوی شیخ عبداللہ کے مکان پر گیا ہے تو سب وہیں جمع ہو گئے۔ جنرل دیبوی نے ان سب کو مخاطب کر کے کہا کہ "مناسب یہی ہے کہ تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس جاؤ" لیکن کسی نے نہ سنا اور پتھروں کی بوچھار اس پر اور اس کے فوجی دستہ پر شروع کر دی اس ہنگامہ میں جنرل دیبوی مارا گیا۔

اس واقعہ نے قاہرہ کے نوجوانوں میں اور زیادہ جوش پیدا کر دیا۔ اٹھ بندوق تلوار، خنجر، نیزہ۔ جو ہاتھ آیا، لے کر مقابلہ کے لئے آمادہ ہو گئے۔

جب نپولین کو جنرل دیوی کے مارے جانے کی خبر پہنچی تو وہ بہت برہم اس نے جنرل بون کو اس کی جگہ مقرر کیا اور دوسرے جنرل دومارتن کو حکم دیا کہ شہر کے چاروں طرف توپیں لگا دی جائیں۔ اس کے بعد اس نے تمام شیخ کو حکم دیا کہ اگر یہ فتنہ فوراً فرو نہ کیا گیا تو وہ قاہرہ کا ایک ایک گھر مسمار کر کے رکھ دے گا۔ لیکن اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا اور فتنہ بدستور قائم رہا۔ آخرکار نپولین نے وہی کیا جو کہا تھا اور پورے دو دن تک شب و روز قاہرہ میں قتل عام جاری رہا۔

اتفاق سے اسی ہنگامے کے دوران میں پانچ فرانسیسی سپاہی، کشتی میں بیٹھ کر جزیرہ روضہ کی طرف سیر کو نکلے، لیکن جب شام کو واپس آئے تو ساحل پر مصری نوجوانوں کی ایک جماعت نے ان پر حملہ کرنا چاہا۔ یہ ڈر کر پھر کشتی میں سوار ہو گئے۔ لیکن گھبرائے ہوئے تھے اس لئے کشتی کا توازن قائم نہ رہ سکا اور سب کے سب دریائے نیل میں ڈوب کر مر گئے۔ انھیں میں سے ایک لوفوا کا دوسرا بھائی تھا، جو عبدالوہاب کی ہلاکت کا باعث ہوا۔

جس وقت خدیجہ کو معلوم ہوا کہ دوسرا بھائی بھی دریائے نیل میں ڈوب کر فنا ہو گیا، تو وہ پھر مسکرائی اور بولی:۔

"واقعی وادی نیل کی دیوی سے زیادہ سچی دیوی کوئی نہیں!"